Uploaded by Kainaat
انسپکٹر جمشید سیریز
ناول نمبر
Atlantis Publications
مكتبة الشهواني
AL SHAHWANI LIBRARY
423528
QR 6
پارسل میں بم
اشتیاق احمد

السلام علیکم!

لیجئے پارسل میں بم حاضر ہے۔ آج کل یوں بھی بم دھماکوں کا دور ہے...... لیکن جس وقت یہ ناول لکھا گیا تھا...... یعنی آج سے تقریباً 30 سال پہلے، اس وقت بموں کے دھماکوں کا ایسا دور نہیں تھا...... آج تو پوری دنیا بموں کے دھماکوں سے لرز رہی ہے...... بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ بموں کے دھماکے تو اب روزمرہ کی چیز بن کر رہ گئے ہیں۔ اب تو اخبارات میں ان کی خبر بھی خاص توجہ سے نہیں پڑھی جاتی...... اللہ تعالیٰ بھی کو ایسے لوگوں سے بچائے جو بم دھماکوں کے ذریعے دنیا کو لرزائے دے رہے ہیں......

انسان انسان کے خون کا کتنا پیاسا ہو گیا ہے...... اس میں درندوں کی سی صفت آ گئی ہے...... ہر مذہب ایک دوسرے سے محبت کا درس دیتا ہے...... دوسروں سے ہمدردی سکھاتا ہے...... وہ تو دیگر مذاہب سے بھی خاص طور پر انسانیت کا سلوک سکھاتا ہے...... اور دیکھا جائے تو جنگوں کے دوران غیر مسلموں سے اکثر اچھے سلوک کیے گئے......

آج بھی ظلم و ستم کی داستانیں دہرائی جا رہی ہیں...... آپ اپنے چاروں طرف دیکھ لیں...... ان حالات میں پارسل میں بم آپ کو ضرور عجیب لگے گا...... چلئے شکر ہے۔ غریب نہیں لگے گا......

سیاہ کار

سرخ رنگ کی عمارت کے ایک کمرے میں اس وقت سات آدمی موجود تھے۔ وہ کرسیوں پر ایک نصف دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ ان کے بالکل سامنے ایک آٹھویں کرسی بھی موجود تھی لیکن وہ خالی تھی۔ ساتوں آدمی بالکل خاموش تھے جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔ اچانک ان کی محویت ٹوٹ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بہت بھدے چہرے والا آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ بھی بیٹھ گئے اور بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

"ہم حیران ہیں استاد، آخر ہمیں اس طرح ایک جگہ جمع کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ اس طرح ایک جگہ جمع ہونا کتنا خطرناک ہے۔ اگر پولیس اس مکان پر چھاپہ مار کر ہم سب کو گرفتار کر لے تو کیا ہوگا۔" ساتوں میں سے ایک نے کہا۔ یہ ان سب سے زیادہ بے چین تھا۔ اس کی آنکھوں سے گہری تشویش جھانک رہی تھی۔

"زیادہ بے تابی کا اظہار نہ کرو۔ جبرو۔ میں جانتا ہوں تم سب حیران ہو، میں نے تمہیں ایک خاص مسئلے پر غور کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔"

"لیکن استاد اگر پولیس یہاں آ جائے۔"

''فکر نہ کرو۔ اس مکان سے باہر نکلنے کے کئی راستے ہیں۔ اس سے پہلے پولیس دروازے پر آئے، میں تمہیں یہاں سے بخیریت نکال باہر کروں گا۔'' استاد نے کہا۔

''تب تو ٹھیک ہے، اچھا اب بتاؤ، کیا بات ہے۔''

''تم تو جانتے ہو، ہم سب کیا کرتے ہیں، لیکن بہت عرصے سے ہمارا کاروبار بہت مندا جا رہا ہے، بار بار ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اگر حالات جوں کے توں رہے تو وہ دن دور نہیں جب نوبت فاقوں پر آ جائے گی۔''

''ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ کیا کوئی اور دھندا شروع کرنے کا ارادہ ہے؟'' جبرو نے پوچھا۔

''نہیں! کام تو ہمارا بہت منافع بخش ہے لیکن راستے میں جو روڑے اٹک جاتے ہیں، ان کی وجہ سے نقصان ہوتا رہتا ہے۔''

''تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ان روڑوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیں۔''

''تم کس کس روڑے کو ہٹاؤ گے، نہیں میں یہ نہیں چاہتا؟''

''تو پھر؟''

''میں تو اپنے راستے سے اس روڑے کو ہٹانا چاہتا ہوں جس نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے، جس کی وجہ سے ہمارا ناک میں دم ہے۔ اگر اس روڑے کا بندوبست ہو جائے تو پھر ہمیں کوئی فکر نہیں رہے گا، پھر کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا، ہم جو چاہیں گے، کر سکیں گے۔''

''تمہارا اشارہ کس طرف ہے استاد!''

''اس شہر کے سب سے بڑے روڑے کی طرف!''

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اسے ختم کر دیں۔''

''ہاں ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہو اور جہاں بھی موقع ملے اسے ختم کر دو۔''

''یہ کیا مشکل کام ہے۔'' جبرو نے کہا۔

''مجھے یہ کام اتنا آسان بھی نظر نہیں آتا۔''

''تم نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے استاد۔ ہم آج کل میں اس کا صفایا کر دیں گے۔''

''دیکھو بہت ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔''

''ہم جانتے ہیں استاد!''

''میں چاہتا ہوں، اس مہم میں میرے ایک آدمی کے جسم پر بھی خراش تک نہ آئے۔''

''تم فکر نہ کرو استاد! ایسا ہی ہوگا۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ پھر کہے دیتا ہوں کام بہت صفائی سے کرنا ہے، کوئی نشان نہ چھوڑنا تاکہ کوئی ہم تک نہ پہنچ سکے۔''

''پولیس لاکھ سر پٹخنے کے بعد بھی ہم تک نہیں پہنچ سکے گی۔''

''بہت خوب، اب میں مطمئن ہوں، لیکن تم سمجھ بھی گئے ہو نا۔ میرا اشارہ کس کی طرف ہے۔'' استاد نے کہا۔

''بہت اچھی طرح سمجھ گئے ہیں استاد، اس شہر میں ایک ہی تو ہمارے راستے کا سب سے بڑا روڑا ہے بلکہ پتھر ہے، ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب اس کی موت قریب آگئی ہے استاد۔ تم انسپکٹر جمشید کے بارے میں ہی کہہ رہے ہو نا؟''

"ہاں!" استاد کے منہ سے نکلا۔

☆☆

انسپکٹر جمشید شام کے ٹھیک پونے پانچ بجے اپنے دفتر سے نکلے۔ انہوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ کار کسی طرف سے نکلی اور ان کی موٹر سائیکل کے پیچھے لگ گئی۔ انہوں نے سیاہ کار کو بیک ویو آئینے میں دیکھا اور سوچنے لگے۔ کیا یہ کار میرے پیچھے لگی ہے، انہوں نے موٹر سائیکل کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ کار کی رفتار بھی تیز ہو گئی، انسپکٹر جمشید سمجھ گئے کہ سیاہ کار ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ اب انہوں نے اس میں بیٹھنے والوں پر نظر ڈالی۔ یہ تین تھے۔ ایک کار چلا رہا تھا۔ دو پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

انہوں نے اپنی موٹر سائیکل اچانک ایک دوسری سڑک پر موڑ دی، اور پیچھے نظر ڈالی۔ سیاہ کار بھی اس سڑک پر مڑ رہی تھی۔ اب انہیں کوئی شک نہ رہا۔ دوسری طرف انہیں احساس ہوا کہ ان سے ایک زبردست غلطی سرزد ہو چکی ہے جس سڑک پر انہوں نے سوچے سمجھے بغیر کار موڑی تھی وہ سیدھی جنگل کی طرف جاتی تھی اور اس میں سے کوئی اور سڑک نہیں نکلتی تھی۔ اب وہ موٹر سائیکل کو روک بھی نہیں سکتے تھے اور واپس بھی نہیں موڑ سکتے تھے۔ مجبوراً وہ جنگل کی طرف بڑھتے گئے۔

جونہی شہری حدود ختم ہوئیں اور جنگل کا سلسلہ شروع ہوا، سیاہ کار کی رفتار تیز ہونے لگی۔

"آخر یہ احمق چاہتے کیا ہیں۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائے۔

اچانک ان کی نظر بیک ویو آئینے پر پڑی۔ وہ چونک اُٹھے سیاہ کار میں پچھلی

سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں اب پستول تھے اور وہ ان کی نالیاں کار کی کھڑکی پر رکھ چکے تھے۔ انسپکٹر جمشید بھانپ گئے کہ ان کے ارادے خطرناک ہیں۔ لہٰذا وہ بھی بچاؤ کے لئے تیار ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ کچھ کرتے، انہوں نے ایک نظر کار کی نمبر پلیٹ پر ڈالی، نمبر ذہن نشین کئے اور ان کے حملے سے بچنے کی ترکیب استعمال کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

جونہی کار ان کے بالکل نزدیک پہنچی۔ انہوں نے موٹر سائیکل کو ایک دم کچی سڑک پر اتارا۔ اسے زوردار بریک لگایا اور اس پر سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ درختوں میں لڑھکتے چلے گئے۔

عین اس وقت جب انہوں نے چھلانگ لگائی۔ دو فائر ایک ساتھ ہوئے اور پھر کار رک گئی۔ انہوں نے لڑھکنے کے دوران دیکھا کار میں سوار تینوں آدمی نیچے اتر آئے تھے اور ان کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ صورت حال خطرناک تھی۔ اس طرح لڑھکتے ہوئے وہ ان کی کسی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے لڑھکتے لڑھکتے ایک درخت کے پیچھے پناہ لی اور ساتھ ہی اپنا پستول نکال کر ان پر ایک فائر اندھا دھند جھونک مارا، دوڑتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ جان گئے تھے کہ مقابل خالی ہاتھ نہیں ہے۔ انہوں نے جھٹ پٹ درختوں کے پیچھے آڑ لے لی اور فائرنگ کرنے لگے۔ جواب میں انسپکٹر جمشید نے ایک گولی اور چلائی۔ وہ اپنی گولیوں کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ اس وقت ان کے پستول میں صرف چار گولیاں باقی رہ گئیں تھی اور فالتو گولیاں ان کے پاس نہیں تھیں جب کہ مقابل تین تھے اور تینوں کے پاس پستول تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس فالتو گولیاں بھی ہوں۔ اس صورت میں وہ چاہتے تھے کہ گولیاں بہت احتیاط سے چلائیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جونہی ان کے پستول سے آخری گولی

نکلی، وہ تینوں ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر خالی ہاتھ ہوتے تو انسپکٹر جمشید کو ان کے ٹوٹ پڑنے کی فکر بھی نہ ہوتی لیکن ایسی صورت میں جبکہ تین تین بھرے ہوئے پستول دشمن کے ہاتھوں میں تھے اگر وہ ان پر ٹوٹ پڑتے تو کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ اسی وقت درخت پر تین طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ وہ سمجھ گئے کہ دشمن تین طرف سے بڑھ رہا ہے، اب خطرہ سر پر تھا۔ اگر وہ ایک ہی سمت سے آتے تو وہ انہیں کافی دیر تک روکے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ درخت سے چند گز کے فاصلے پر مکئی کی فصل تیار کھڑی تھی انہوں نے سوچا اگر وہ اس کے اندر گھس جائیں تو دشمن کی گولیوں سے بچ سکتے ہیں۔

یہ سوچ کر وہ مڑے، اپنا پستول جیب میں ڈالا اور چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوگئے۔ یہ چھلانگ ان کی موت کا پیغام بھی بن سکتی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ جونہی چھلانگ لگائیں وہ تینوں ایک ساتھ ان پر گولی چلا دیں، اس صورت میں کوئی ایک گولی بھی ان کے لگ سکتی تھی، اچانک انکے ذہن میں ایک ترکیب آئی، انہوں نے پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور فصل کے مخالف سمت میں پھینک دیا۔ پتھر کافی بڑا تھا۔ اس کے گرنے کی آواز پیدا ہوئی تو حملہ آور آدمی سمجھے کہ ان کے مقابل نے اس سمت میں چھلانگ لگائی ہے۔ انہوں نے ایک ساتھ پتھر کی سمت میں فائر کیے اور عین اسی وقت انسپکٹر جمشید نے فصل کے اندر چھلانگ لگا دی۔ ساتھ ہی ان تینوں میں سے کوئی چلایا۔

''ارے! وہ فصل میں کود گیا۔''

☆☆

محمود اور فاروق نیشنل پارک میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اسکول کا کام

کر چکے تھے لیکن ابھی تک پونے پانچ نہیں بجے تھے۔

وہ ہمیشہ یہاں سے پونے پانچ بجے گھر جانے کے لئے اٹھتے تھے۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید گھر پہنچ جاتے تھے۔ صرف ایک آدھ منٹ آگے پیچھے ہوتا تھا۔ پھر وہ سب اکٹھے شام کی چائے پیتے۔

''آج کل سخت بور ہو رہا ہوں۔'' محمود نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''تو میں کب نرم بور ہو رہا ہوں۔'' آج کل کوئی ہل چل ہی نہیں ہو رہی ہے، ہر طرف سکون ہی سکون ہے، صبح اٹھتے ہیں، ناشتا کرتے ہیں اور اسکول آجاتے ہیں۔ اسکول سے گھر اور کچھ دیر آرام کر کے نیشنل پارک میں۔ یہاں سے پھر گھر۔ میں خود اس روز کے معمول سے تنگ آگیا ہوں۔ نہ کوئی ہنگامہ، نہ کوئی دلچسپی۔ نہ کوئی سسپنس، کریں تو کیا کریں۔'' فاروق اس کے جواب میں بولتا ہی چلا گیا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں جب سے وہ چوری والا کیس ختم ہوا ہے بوریت ہی بوریت ہے۔'' محمود بولا۔

''تو کیوں نہ ہم خود ہی کوئی واردات کر ڈالیں۔'' فاروق نے نئی بات کہی۔

''کیا مطلب! کیا ہم چوری کریں، یا کہیں ڈاکہ ڈالیں۔ یاد رکھو ابا جان ذرا بھی لحاظ نہیں کریں گے۔ بہت فرض شناس ہیں، پکڑ کر اندر بند کردیں گے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو پھر...... جو تمہارا مطلب تھا؟ وہ کیوں نہیں بتاتے۔''

''وہی تو بتانے جا رہا ہوں، تم بتانے بھی دو۔''

''لو اور سنو...... کیا میں نے تمہاری زبان پکڑ رکھی ہے۔'' فاروق نے جھلا کر کہا۔

''تم بے چارے میری زبان کیا پکڑو گے۔'' محمود نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں! تمہاری زبان تو فرزانہ ہی پکڑ سکتی ہے۔''

''لگ گئی اب تو زبان پکڑنے کی۔ بات کیا ہو رہی تھی اور تم کہاں کی لے بیٹھے۔''

''تو جہاں کی بات ہو رہی تھی وہیں کی کیوں نہیں لے بیٹھتے۔'' فاروق مسکرایا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ ہم خود کوئی واردات کریں۔''

''اور میں پوچھ رہا تھا کہ صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''ہم اخبار میں ایک اشتہار چھپواتے ہیں۔''

''اور وہ اشتہار کیا ہوگا؟''

''یہ کہ۔ اے شہر کے جرائم پیشہ لوگو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہیں تمہیں سانپ تو نہیں سونگھ گیا ہے! آخر تم اتنے کام چور کیوں ہو گئے ہو۔ کون سے کونوں کھدروں میں رہا کرتے ہو ان دنوں ذرا میدان میں آؤ، تاکہ تم سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔ اس لئے کہ آج کل دو دو تو کیا ہم ایک ایک ہاتھ بھی کرنے کو ترس رہے ہیں۔۔۔'' محمود بولتا چلا گیا۔ فاروق بے تحاشہ ہنس رہا تھا۔

''بس کرو یار بس کرو۔ ابا جان نے اگر اس قسم کا اشتہار ہماری طرف سے دیکھ لیا تو وہ مرمت ہوگی کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے اور اگر کسی موقعے پر بھولنے لگیں گے تو فرزانہ ضرور ہمیں یاد کرا دیا کریگی وہ مذاق اڑائے گی وہ کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''تو پھر تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔''

''کیا ضرورت ہے کوئی گڑبڑ کرنے کی۔ میں نے ایک پُرامن ترکیب سوچ

لی ہے۔'' فاروق بولا۔

''وہ پُرامن ترکیب کیا ہے۔''

''فارغ اوقات میں جاسوسی ناول پڑھے جائیں۔''

''تو پھر اُٹھو، پونے پانچ سے تین منٹ زیادہ ہو گئے ہیں۔ کہیں ابا جان ہم سے پہلے نہ پہنچ جائیں، ہم راستے میں قومی لائبریری سے دو ناول بھی لیتے چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

دونوں پارک سے باہر نکل آئے اور لائبریری کی طرف چل پڑے۔

''دو کے بجائے ہمیں تین ناول ایشو کرانے چاہئیں۔'' محمود کو چلتے چلتے کچھ خیال آیا۔

''کیوں تین کس لئے۔'' فاروق نے پوچھا۔

''ایک فرزانہ لے لے گی۔ اگر ہم دو لے کر گئے تو وہ ہمیں بھی نہیں پڑھنے دے گی اور خود بھی نہیں پڑھے گی۔''

''بھئی ٹھیک ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ وہ اپنی والی کتاب کا کرایہ ہمیں ہرگز نہیں دے گی، وہ ہمیں اپنی جیب سے دینا پڑے گا؟'' فاروق نے اس سے کہا۔

''بھئی اگر ناول پڑھنے ہیں تو اس کا کرایہ دینا ہی پڑے گا، ورنہ وہ ہمیں بھی نہیں پڑھنے دے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ مجبوری ہے۔'' فاروق نے شانے اُچکائے۔

باتیں کرتے ہوئے وہ لائبریری تک پہنچ گئے۔ انہوں نے تین کتابیں پسند کیں اور واپس مڑے۔ عین اسی وقت محمود کے منہ سے نکلا۔

''ارے!''

اس کی آنکھیں ایک سمت میں اُٹھی ہوئی تھیں اور ان میں حد درجہ حیرت تھی۔ فاروق نے بھی جلدی سے اس سمت میں دیکھا۔ اس کے والد موٹر سائیکل پر سوار برق رفتاری سے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک سیاہ کار تھی۔

☆☆☆

اُن کی آمد

''اب کیا کیا جائے۔'' تینوں میں سے ایک نے کہا۔

''گنے کے کھیت میں گھس کر اسے پکڑ لینا ناممکن ہے۔ اس وقت تک اس نے صرف دو گولیاں چلائی ہیں اور ابھی اس کے پستول میں چار گولیاں تو ہوں گی ہی۔ اس لئے کھیت میں گھسنا خطرناک ہوگا، کیوں نہ ہم تینوں کھیت کے تین کونوں پر کھڑے ہو جائیں۔ وہ بھی اس طرح کہ درختوں کی آڑ لے کر تا کہ جونہی وہ کھیت سے باہر نکلے، ہم میں سے ایک کی گولی کا نشانہ بن جائے، دوسرے نے تجویز پیش کی۔

''لیکن اگر وہ چوتھی سمت سے نکل گیا تو؟'' تیسرے نے اعتراض کیا۔

''چوتھی سمت ہم سڑک والی رکھیں گے، اگرچہ اس سمت میں ہم نہیں ہوں گے لیکن کھیت کے کونوں سے سڑک کا منظر صاف دکھائی دے گا اور اس طرح وہ چوتھی طرف بھی محفوظ نہیں ہوگا۔'' پہلا بولا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہو، لیکن اگر وہ کسی طرح آنکھ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا بچ نکلنا مشکل نہیں ہوگا، کیونکہ اسی طرف اس کی موٹر سائیکل اور ہماری کار کھڑی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''اس کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ اس کی موٹر سائیکل کا ٹائر ایک گولی چلا کر

بیکار کر دو اور اپنی کار کا انجن بند کر کے چابی جیب میں ڈال لو۔'' پہلا بولا۔

''یہ بہت شاندار ترکیب ہے۔ اچھا تو میں سڑک کے کنارے جا کر اس کی موٹر سائیکل بیکار کرتا ہوں اور کار کا انجن بند کیے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم یہاں درختوں کی آڑ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

ان میں سے ایک سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ باقی دو درختوں کی اوٹ میں ہو کر فصل کو بغور دیکھنے لگے۔ ایک جگہ انہیں گنے ہلتے نظر آئے۔ دونوں نے ایک ساتھ فائر کیے، لیکن جواب میں کوئی چیخ سنائی نہ دی۔

''وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔'' پہلا بولا۔

''آج ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔'' دوسرے نے کہا۔

''مت بھولو کہ اس کے پستول میں ابھی تک کم از کم چار گولیاں ہیں جبکہ ہم صرف تین ہیں۔''

''بزدل ہو تم! ہم تین ہیں اور وہ اکیلا ہے۔ پھر بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے۔''

''ڈرتا کون کم بخت ہے۔''

دوسری طرف سڑک کی طرف جانے والا ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور پھر وہیں سے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے۔ کیا فائر تم نے کیا تھا۔''

''ہاں۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔''

ان میں سے دوسرے نے جواب دیا لیکن یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کی آواز جونہی فضا میں ابھری۔ ایک گولی سیدھی اس کی طرف آئی لیکن وہ بھی بہت تیز تھا۔ ایک دم زمین پر گر گیا چونکہ دوسرا چند قدم کے فاصلے پر ایک

اور درخت کے پیچھے تھا اس لیے وہ محفوظ رہا۔

''اس نے تمہاری آواز سن کر فائر کیا ہے۔ بے وقوف کہیں کے۔ سرگوشیوں میں بات کرو۔'' پہلے نے غصے میں آ کر کہا۔

''غل ۔۔۔ غلطی ہو گئی۔'' دوسرا ہکلایا۔ وہ ابھی تک لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اٹھنے کی جرأت نہ کی اور چپ چاپ لیٹا رہا۔

''چلو۔ اب اس کے پاس تین گولیاں رہ گئی ہیں، ایک اور ضائع ہو گئی۔''

''تو کیا میں ایک بار پھر اونچی آواز میں بات کروں۔'' دوسرے نے کہا۔

''نہیں، اس مرتبہ میں حلق سے آواز نکالوں گا۔ لیکن میں ایسا زمین پر لیٹ کر کروں گا۔''

پہلے نے کہا اور زمین پر لیٹ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا'' وہ رہا اس طرح۔ فائر کرو۔''

یہ الفاظ اس نے چلا کر کہے تھے اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کو اشارے سے منع کیا تھا کہ فائر نہ کرے کیونکہ وہ تو انسپکٹر جمشید کی ایک اور گولی ضائع کرنے کے چکر میں تھا۔ ان کی امید کے مطابق ایک فائر ہوا اور گولی اس کے سر کے بالشت بھر اوپر سے گزر گئی۔

''لو بھئی۔ ایک اور گئی۔ اب صرف دو گولیاں اس کے پاس رہ گئی ہیں۔''

''ہو سکتا ہے، اس نے گولیوں کی پیٹی لگا رکھی ہو۔'' دوسرے نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں اتم انسپکٹر جمشید کو نہیں جانتے۔ وہ کبھی پیٹھ نہیں لگاتا۔''

عین اسی وقت ان کے تیسرے ساتھی نے انسپکٹر جمشید کی موٹر سائیکل کے ٹائر پر گولی چلا دی۔ ٹائر ایک دھماکے سے پھٹا اور اس کی آواز سے پورا جنگل گونج اٹھا۔ درختوں کے پرندے جو پہلے ہی فائروں کی وجہ سے اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے، سہم کر اوپر ہی اوپر اٹھتے چلے گئے۔

☆☆

انسپکٹر جمشید نے گنے کے کھیت میں چھلانگ لگائی اور سینے کے بل لیٹ کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ خود کو کسی قدر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ یونہی رینگتے رہے، اچانک ان پر ایک فائر ہوا، جواب میں انہوں نے بھی پلٹ کر فائر کرنا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئے کہ نہ جانے فائر کرنے والا کس جگہ موجود ہے۔ کچھ دیر بعد انہیں کسی کی آواز سنائی دی اور اس آواز پر انہوں نے ایک فائر جھونک ہی مارا۔ کچھ دیر بعد انہیں پھر ایک آواز سنائی دی۔ ''وہ رہا اس طرف فائر کرو۔''

اس آواز کے ساتھ نشانہ لیتے ہوئے جواب میں انہوں نے پھر فائر کیا۔

اب ان کے پستول میں صرف دو گولیاں بچی تھیں اور وہ بہت فکر مند ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تک غور کرتے رہنے کے بعد انہوں نے گنے کے کھیت میں سے نکل کر موٹر سائیکل تک پہنچنے کا پروگرام بنایا۔ اچانک انہوں نے ایک ٹائر پھٹنے کی آواز سنی اور وہ دھک سے رہ گئے۔ یہ ضرور ان کی موٹر سائیکل کے ٹائر کے پھٹنے کی آواز تھی۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے کہ آخر دشمن کیا چال چلنا چاہتا ہے۔ غور کرتے رہنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو میں سڑک کی طرف ہی جاؤں گا۔ انہوں نے سینے کے بل لیٹتے ہوئے ایک چکر کاٹا اور

سڑک کی طرف منہ کر کے رینگنے لگے۔ اس حالت میں کہ پستول اب بھی ان کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ان کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کھیت کے کنارے سے تھوڑے فاصلے پر رک کر انہوں نے سر اوپر اٹھایا۔ انہیں کار اور موٹر سائیکل کھڑی نظر آئیں۔ انہوں نے سوچا، کیا ہوا اگر انہوں نے موٹر سائیکل کا ٹائر بے کار کر دیا، میں ان کی کار کیوں نہ لے اڑوں لیکن یہ درمیانی فاصلہ کیسے طے ہو، وہ تینوں ضرور تاک لگائے بیٹھے ہوں گے، کھیت سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ابھی تک دشمنوں کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کھیت کے کون سے حصے میں ہیں، اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کنارے کے اس قدر نزدیک ہیں تو وہ کبھی کے حملہ کر چکے ہوتے۔ انسپکٹر جمشید کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا وہ سوچ رہے تھے کہ اس موقعے پر کیا کیا جا سکتا ہے۔ تین مسلح دشمنوں سے کیسے نبٹا جا سکتا ہے، جبکہ ان کی موٹر سائیکل بھی بیکار کر دی گئی تھی۔

اچانک انہیں ایک تدبیر سوجھ گئی۔ ان کے قریب مٹی کا ایک ڈھیلا پڑا تھا۔ انہوں نے وہ اٹھایا اور پوری قوت سے اندر ہی اندر ڈھیلے کو سڑک کی مخالف سمت میں پھینک دیا۔ گنوں کی سرسراہٹ کی تیز آواز فضا میں ابھری اور ان میں سے دو چلا اٹھے۔

''ارے وہ بھاگا جا رہا ہے۔ گھس چلو کھیت میں۔''

انسپکٹر جمشید دبک گئے۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ان کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کھیت سے باہر نکلے اور آواز پیدا کیے بغیر کار کی طرف دوڑنے لگے۔ ان کا سانس اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے پھول چکا تھا۔

وہ کار تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کا انجن اسٹارٹ کرنا چاہا اور اس

وقت وہ دھک سے رہ گئے، جب انہوں نے دیکھا انجن کی چابی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ بے سدھ کار میں بیٹھے رہ گئے۔ عین اس وقت انہوں نے دوسری طرف سے ایک کار کے آنے کی آواز سنی۔

اب کار میں بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ اس سے اترے اور سڑک کے دوسری طرف اتر کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ سڑک کے باہر گنے کا کھیت تھا اور ان کے دشمن ابھی کھیت سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اچانک انہوں نے تینوں کو نکل کر کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور انسپکٹر جمشید ایسی حالت میں ان پر فائر کرنا چاہتے تھے کیونکہ گولی ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ جونہی یہ تینوں اٹھ کھڑے ہوں گے میں ان پر فائر کردوں گا۔ اچانک شہر کی طرف سے آنے والی کار کا ہارن انہیں سنائی دیا۔ وہ کار لحہ بہ لحہ سیاہ کار اور ان کی موٹر سائیکل سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ نزدیک آنے پر اس کی رفتار سست ہو گئی۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ یہ کوئی ٹیکسی تھی۔ آخر کار وہ کالی کار کے پیچھے رُک گئی اور اس میں سے دو لڑکے اترے۔

''انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے، یہ محمود اور فاروق تھے۔

☆☆

''تم نے دیکھا۔ یہ ابا جان تھے موٹر سائیکل پر!'' محمود کے منہ سے نکلا۔

''اور ان کے پیچھے پوری رفتار پر سیاہ کار تھی۔'' فاروق بڑبڑایا۔

''ہاں! لیکن اس کا کیا مطلب ہوا۔ یہ سڑک تو جنگل کی طرف جاتی ہے۔'' محمود گہری سوچ میں تھا۔

''اور اس وقت ابا جان کا گھر جانے کا وقت ہے۔''

''تو کہیں وہ کالی کار سے بچنے کے لئے تو اس طرف نہیں نکل گئے۔'' محمود کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

''لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ بہر حال اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سیاہ کار ان کا پیچھا کر رہی تھی۔''

''تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں گے۔''

''اگر یہ نازک وقت نہ ہوتا تو میں تمہاری بات کا بہت مزیدار جواب دے سکتا تھا۔'' فاروق بولا۔

'خدا کے لئے اپنے مزیدار جواب کو فی الحال اپنے پاس ہی رکھو اور سوچو کہ کیا کریں۔''

''ایک ٹیکسی پکڑ کر ان کے پیچھے چلتے ہیں۔'' فاروق نے تجویز بتائی۔

''گڈ! کیا تمہاری جیب میں کچھ روپے ہیں۔''

''ہاں تقریباً دس روپے تو ہوں گے ہی۔''

''اور تقریباً اتنے ہی میرے پاس بھی ہیں۔''

''بس تو پھر۔ بن گیا کام۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ٹیکسی میں سفر کر سکتے ہیں۔''

''کیوں نہیں۔''

''ارے تو پھر کھڑے سوچ کیا رہے ہو، روکو نہ کوئی ٹیکسی۔''

''ارے ہاں! ہم تو پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔''

دونوں نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ دُور سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ انہوں نے بے تابی کے عالم میں ہاتھ اٹھا دیئے اور زور زور سے اشارہ کرنے لگے۔ ٹیکسی ان کے قریب آ کر رُک گئی۔ دونوں طوفان

کی سی تیزی سے اندر گھس گئے اور بولے۔

''سیدھے چلو اور برق رفتاری سے چلو۔''

دونوں بے تابی سے اُچک اُچک کر سامنے دیکھ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں سیاہ کار یا موٹر سائیکل نظر نہیں آئی تھی۔ دونوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔

''ہم نے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیا۔'' محمود نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''اب بُرے بُرے منہ بنانے کا کیا فائدہ۔''

''نہ جانے وہ کتنی دور نکل گئے ہوں۔''

''کیوں بھائی ٹیکسی ڈرائیور۔ کیا تم اس سے تیز نہیں چل سکتے۔'' محمود نے پوچھا۔

''اس سے تیز چلانا خطرناک ہوگا۔'' ڈرائیور بولا۔

''لیکن معاملہ جو آگے پیش آنے والا ہے، اس سے بھی خطرناک ہے۔'' فاروق بولا۔

''کیا مطلب؟''

''ہمارے والد چند دشمنوں کے درمیان گھر گئے ہیں۔ اگر تم کچھ رفتار بڑھا دو تو ہم ان کی مدد کر سکتے ہیں۔''

''اچھا بڑھا دیتا ہوں۔ لیکن معاملہ کیا ہے، کہیں میں تو نہ پھنس جاؤں گا۔''

''بالکل بے فکر رہو۔ کیا تم انسپکٹر جمشید کے نام سے واقف ہو۔''

''ان سے کون نہ واقف ہوگا۔ پورے شہر میں ان سے زیادہ نامور کون ہے۔

''تو بس پھر ان کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''کیا۔!'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں!''

''لیکن ان کے بچے تو ہر موقعے پر ان کے ساتھ ہوتے ہیں یا مدد کرنے عین وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے ان کے متعلق اخبارات میں بار ہا پڑھا ہے۔''

''کیا تم جانتے ہو۔ ان کے بچوں کے کیا نام ہیں۔''

''ہاں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ!''

''تو بس پھر۔ اس وقت تمہاری ٹیکسی میں محمود اور فاروق بیٹھے ہیں۔''

''ارے!'' وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں! اور اب مہربانی فرما کر رفتار بڑھا دو۔''

اس کے بعد انہیں ڈرائیور سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ وہ بتدریج رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ شاید وہ ڈرائیونگ میں ماہر بھی بہت تھا۔ اور پھر انہیں سیاہ کار نظر آ ہی گئی۔ وہ ابھی بہت دور تھی۔

''وہ رہی سیاہ کار!'' محمود کے منہ سے نکلا۔

''کیا آپ کے والد اس کار میں ہیں۔'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس میں تو وہ لوگ ہیں جو ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ تو کار سے آگے موٹر سائیکل پر سوار ہیں۔''

''لیکن وہ کار تو سڑک پر کھڑی ہے چل نہیں رہی۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''اچھا۔ تو پھر کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل بھی کھڑی ہوگی۔''

جونہی وہ نزدیک پہنچے انہیں گنّے کے کھیت کی طرف سے تین لمبے تڑنگے

نوجوان کھیت سے باہر نکلتے نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھ کر چونک اٹھے۔ اتنی دیر میں ڈرائیور ٹیکسی روک چکا تھا کیونکہ سیاہ کار نے کافی راستہ روک رکھا تھا۔ دونوں بے فکری سے ٹیکسی سے نیچے اُتر آئے۔ نیچے اُترتے ہی کچھ فاصلے پر اپنے ابا جان کی موٹر سائیکل کھڑی دیکھی۔ موٹر سائیکل کا اگلا ٹائر پھٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

اُستاد کا اُستاد

ابھی انہوں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا کہ وہ تینوں سڑک پر پہنچ گئے اور ان دونوں کو دیکھ کر چونک اُٹھے۔ پھر انہوں نے چاروں طرف بغور دیکھا لیکن انسپکٹر جمشید انہیں کہیں بھی نظر نہ آئے۔

''وہ ضرور ہماری کسی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔'' ان میں سے ایک نے دھیمی آواز میں کہا لیکن یہ جملہ محمود اور فاروق کے کانوں تک پہنچ گیا۔ وہ لرز اُٹھے۔ ان کے دماغ سائیں سائیں کرنے لگے۔

''تو پھر۔ کیا ہم چلیں۔''

''ہاں! اب یہاں سے چل ہی دینا چاہیے۔''

''مگر۔۔۔ یہ لڑکے۔؟'' ایک نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''میں خود حیران ہوں۔ یہاں کیا لینے آئے ہیں۔''

''ٹھہرو۔ میں ان سے پوچھتا ہوں۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور محمود اور فاروق کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

''تم ادھر کس لئے آئے ہو۔'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کیوں اس طرف آنا منع ہے؟'' محمود نے بگڑ کر کہا۔

''نہیں منع نہیں ہے۔ پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں تم اس طرف کیا کرنے آئے

ہو۔''

''یہی سوال ہم تم سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو۔'' فاروق بولا۔

''بدتمیز لڑکے جو پوچھا جا رہا ہے۔ اس کا جواب دو۔''

''ہم تو اس طرف اکثر شکار کھیلنے آتے ہیں۔ گلہریوں کا شکار!'' محمود نے اس خیال سے کہا کہ کہیں بات نہ بڑھ جائے۔

''اوہ!'' تینوں مطمئن ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہم ایک خطرناک آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے ادھر آئے ہیں۔ وہ ملک و قوم کا دشمن ہے، اور یہیں کہیں چھپ گیا ہے، بہتر ہوگا کہ آج تم ان اطراف میں شکار نہ کھیلو۔''

''اچھا۔'' محمود بولا۔

تینوں مڑے اور سیاہ کار کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ اس وقت وہ انسپکٹر جمشید کے پستول کی زد میں تھے لیکن ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول تھے جبکہ ان کے پستول میں دو گولیاں تھیں اور انہیں ضرورت تین گولیوں کی تھی۔ پھر بھی وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان میں سے ایک کے پستول کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا، ساتھ ہی ایک کے ہاتھ سے پستول اچھل کر دور جا گرا۔ محمود اور فاروق لپک کر کار کی آڑ میں ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے انسپکٹر جمشید کی گرج دار آواز سنی۔

''پستول نیچے گرا دو۔ اس وقت تم میرے پستول کی زد پر ہو۔''

تینوں سوچ میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انسپکٹر ۔شید کے پستول میں صرف ایک گولی رہ گئی ہے اور ایک گولی سے وہ ان تینوں کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ انسپکٹر

جمشید نے ان کی ہچکچاہٹ کو دیکھا تو پھر بولے۔

''سوچ کیا رہے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے پستول میں اس وقت صرف ایک گولی ہے لیکن میں اس گولی سے تم میں سے کم از کم ایک کا تو صفایا کر ہی سکتا ہوں۔ اگر پستول نہیں پھینکتے تو پھر میں کسی ایک کو گولی مارے دیتا ہوں۔''

انہوں نے گھبرا کر پستول زمین پر پھینک دیئے۔

''محمود، فاروق! تم بڑے اچھے وقت پر آئے، ان کے پستول اٹھا لو۔ وہ بھی اس طرح کہ تم میرے اور ان کے درمیان میں نہ آنا۔'' انسپکٹر جمشید نے انہیں ہدایت دی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تینوں پستول اپنے قبضے میں کر لئے۔

ٹیکسی ڈرائیور حیرت کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

پھر انہوں نے درخت کی اوٹ سے انسپکٹر جمشید کو نکلتے دیکھا۔ ان کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے والد کیچڑ سے لت پت کوئی بھوت لگ رہے تھے۔

''مسٹر ٹیکسی ڈرائیور۔ تمہارے پاس رسی ہوگی۔'' انہوں نے قریب پہنچ کر اس سے پوچھا۔

''جی۔ جی ہاں۔ ہے۔''

''تو پھر اس رسی سے ان تینوں کے ہاتھ ان کی پشت پر باندھ دو۔ اطمینان رکھو، میں ملک و قوم کا دشمن نہیں بلکہ دشمن تو یہ ہیں۔ اور تم میری مدد کر کے ملک اور قوم کی خدمت کرو گے۔''

''جی میں جانتا ہوں۔''

''بس تو پھر۔ فوراً رسی نکال کر ان تینوں کو جکڑ دو۔''

ڈرائیور نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور جلد ہی تینوں کے ہاتھ باندھ دیئے۔

"اور اب میرے دوستو! تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تم میری جان کیوں لینا چاہتے تھے، تمہیں کس نے اس کام پر اکسایا اور یہ کار کس کی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

جواب میں وہ تینوں خاموش رہے۔

"نہیں بتاتے میں سمجھ گیا، تم لاتوں کے بھوت ہو۔ خیر میں تم سے معلوم کرلوں گا۔ محمود، فاروق، تم ٹیکسی میں ہی آؤ گے میں انہیں لے کر ان کی کار میں چلوں گا۔"

"ابا جان! یہ خطرناک ہوگا۔" محمود بول اٹھا۔

"کیوں!" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ اگر کار آپ چلائیں گے تو ان کو پستول کی زد میں نہیں رکھ سکیں گے اور اگر ان میں سے کسی کو کار چلانے کے لئے کہیں گے تو وہ کوئی غلط حرکت کرسکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر کیا کرنا چاہیے۔"

"آپ ان تینوں کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ جایئے۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی چلائے گا، اس طرح کسی خطرے کا سامنا کئے بغیر آپ گھر پہنچ سکتے ہیں۔"

"اور تم دونوں سیاہ کار اور میری موٹر سائیکل!" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ہم کار اور موٹر سائیکل کے پاس ٹھہرتے ہیں، آپ گھر جا کر انکل اکرام کو فون کر کے یہاں بھیج دیں۔ ہم ان دونوں چیزوں سمیت ان کے ساتھ گھر پہنچ جائیں گے۔"

"لاجواب ترکیب ہے۔" انسپکٹر جمشید نے خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر آپ روانہ ہو جائیں۔"

انسپکٹر جمشید نے ان تینوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ خود اگلی سیٹ پر بیٹھے اور مڑ کر پستول ان پر تان دیا۔ اس وقت محمود آگے بڑھا۔

"ابا جان آپ کے پستول میں صرف ایک گولی ہے، اس لئے ان میں سے ایک کا پستول بھی ساتھ لے لیں۔"

"بہت خوب!" انہوں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا:

"باقی دو پستول تم ساتھ لیتے آنا۔"

"جی اچھا۔"

"چلو میاں ڈرائیور۔" انسپکٹر جمشید نے ڈرائیور سے کہا۔

دونوں سڑک پر کھڑے جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھتے رہے۔

☆☆

بیگم جمشید اور فرزانہ سخت بے چین تھیں۔ چھ بج رہے تھے اور ابھی تک نہ انسپکٹر جمشید لوٹے تھے اور نہ ہی محمود اور فاروق نیشنل پارک سے واپس آئے تھے۔

"ان دونوں سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ وقت پر پہنچ جایا کرو، مگر یہ سنتے ہیں نہیں۔" بیگم جمشید نے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

"اور ابا جان بھی تو اب تک نہیں آئے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! کم از کم ان کے متعلق تو معلوم کر ہی سکتی ہو۔ ذرا فون کر کے معلوم تو کرو۔ کیا وہ ابھی تک دفتر میں بیٹھے ہیں۔"

"اچھا امی جان! میں ابھی جا کر پتا کرتی ہوں۔"

فرزانہ نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ بیگم شیرازی کے ہاں جا کر اس نے

فون کیا اور واپس آ گئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔"

"وہ ایک گھنٹہ پہلے دفتر سے چل چکے ہیں۔"

"کیا!!۔ تو پھر گھر کیوں نہیں پہنچے۔ کیا تم نے پوچھا تھا کہ وہ گھر آنے کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے۔"

"جی ہاں!"

"یا اللہ خیر۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے۔"

"اس صورت میں وہ ہمیں فون ضرور کرتے۔"

"ہو سکتا ہے امی۔ انہیں کوئی کام پڑ گیا ہو۔"

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ اور محمود اور فاروق کو کیا ہوا۔ کیا انہیں بھی کوئی کام پڑ گیا۔"

"ان پر تو مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔ آ لینے دو۔ آج ان کے کان ضرور کھینچوں گی۔"

"ضرور کھینچئے گا۔ وہ لاپروا بھی تو بہت ہو گئے ہیں۔"

"اب ہم کیا کریں۔ خدا جانے تمہارے ابا جان کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔"

"ہوں۔ کیوں نہ میں انکل اکرام کو فون کر کے بلا لوں۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

فرزانہ دوبارہ بیگم شیرازی کے گھر گئی، سب انسپکٹر اکرام کو فون کیا اور واپس پلٹی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی!"

"میں نے فون کر دیا ہے امی۔ وہ آ رہے ہیں۔"

"اچھا۔ چائے میز پر رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں اسے دوبارہ گرم کر کے لاتی ہوں۔" بیگم جمشید نے تھوڑی دیر بعد کہا اور برتن اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ دونوں چونک اٹھیں بیگم جمشید جس جگہ تھیں، انہوں نے برتن وہیں فرش پر رکھ دیئے اور دروازے کی طرف دوڑیں۔ فرزانہ ان سے پہلے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے ابا جان کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اتنی دیر میں بیگم جمشید بھی وہاں پہنچ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے دونوں دھک سے رہ گئیں۔ دروازے پر انسپکٹر جمشید کی بجائے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی، اور چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی۔ جن میں آدھے بال سفید اور آدھے کالے تھے۔ اس نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"فرمایئے!" بیگم جمشید نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"کیا انسپکٹر جمشید یہیں رہتے ہیں۔" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں!"

"مجھے اُن سے ملنا ہے۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"لیکن وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔"

"اوہ! وہ کتنی دیر تک آ جائیں گے۔"

"شاید چند منٹ بعد آ جائیں۔ یا شاید کئی گھنٹے نہ آئیں، کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"دراصل میرے پاس ان کی امانت ہے۔ جو میں انہی کے ہاتھوں میں دینا

چاہتا ہوں۔ اس لئے میرا ان کے ملنا بہت ضروری ہے۔ کیا میں کچھ دیر ان کا انتظار نہ کرلوں۔"

"آجایئے اندر!" بیگم جمشید نے کہا اور ان کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

"بیٹی تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور خود بھی ان کے پاس بیٹھو!"

"جی اچھا امی جان۔"

وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی اور جب دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو فرزانہ نے پوچھا۔

"وہ کیا چیز ہے جو آپ ابا جان کو دینا چاہتے ہیں۔"

"ایک پارسل ہے بیٹی۔ یہ رہا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا پارسل نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

فرزانہ نے دیکھا کہ اس موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "صرف انسپکٹر جمشید کے لئے۔"

☆☆

سُرخ رنگ کی اس عمارت میں اُن ساتوں جرائم پیشہ لوگوں کا اُستاد اس وقت تنہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ اچانک اس کی گھنٹی بجی۔ اس نے گھبرا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

"ہیلو۔ کون صاحب!"

"اُستا کا اُستاد!" دوسری طرف سے بارعب آواز آئی۔

"آپ!!" اُستاد کی آواز میں لرزش تھی۔

"ہاں میں! تم نے انسپکٹر جمشید کا کیا بندوبست کیا۔"

"میں نے اپنے آدمیوں کو پٹی پڑھائی ہے کہ انسپکٹر جمشید ہمارے راستے کا

پتھر ہے، اسے راستے سے ہٹانے کے بعد ہی ہم اس شہر میں سکون سے رہ سکتے ہیں۔ آپ کا ذکر درمیان میں نہیں لایا گیا۔"

"بہت خوب!" ہم یہی چاہتے تھے۔ آگے کہو۔"

"پروگرام کے مطابق تین آدمیوں کو آج پونے پانچ بجے کے بعد یعنی اس کے دفتر سے نکلنے کے بعد، موقع محل دیکھ کر اس پر حملہ کرنا ہے۔ اس وقت تک وہ حملہ کر چکے ہوں گے اور اگر وہ کسی طرح اس حملے سے بچ بھی گیا تو باقی چار آدمی سائے کی طرح اس کا پیچھا کریں گے اور اسے وہ ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"بہت خوب۔ میں اُس حملے کا نتیجہ سننے کے لئے فون پر موجود ہوں۔ اگر تمہاری طرف سے ان تینوں کی ناکامی کی اطلاع ملی تو میں خود میدان میں اتروں گا۔ میں نے بھی ایک زوردار ترکیب سوچی ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں، وہ ترکیب کیا ہے۔"

"ہاں! کیونکہ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے، میں نے ایک چھوٹے سے بم کا پارسل بنایا ہے۔ اس کے اُوپر اچھی طرح لپیٹ دیا گیا ہے، اور اُوپر لکھ دیا ہے۔ "صرف انسپکٹر جمشید کے لئے۔" میں نے اس پارسل کو انسپکٹر جمشید کے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دیا ہے، جونہی تمہاری طرف سے ناکامی کی اطلاع ملی، یہ پارسل اس کے گھر پہنچ جائے گا۔ پھر اگر تمہارے چار آدمی بھی ناکام ہو گئے تو بھی وہ زندہ نہ بچ سکے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"اس بم کی وجہ سے۔ جونہی انسپکٹر جمشید اسے کھولے گا، بم ہوا لگتے ہی پھٹ جائے گا اور انسپکٹر جمشید کا چہرہ گردن سے غائب ہو جائے گا۔"

"یہ تو بہت حیرت انگیز بم ہے۔ جو صرف ہوا لگنے سے پھٹ جائے گا۔"

''ہاں! اور جب تک اسے ہوا نہیں لگے گی، وہ نہیں پھٹے گا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا دن انسپکٹر جمشید کی زندگی کا آخری دن ہے۔'' اُستاد نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں!'' اس کی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

کابلی والا

ٹیکسی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ وہ حیران رہ گئے تھے کہ آج کا دن کس قدر ہنگاموں سے لبریز ہے۔ اب پھر ایک نیلے رنگ کی کار ان کی ٹیکسی کے پیچھے نظر آئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ ان سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔

''کیا یہ نیلے رنگ کی کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر تم نے رفتار نہ بڑھائی تو وہ ہمیں جلدی آلیں گے۔''

''کار میں کتنے آدمی ہیں؟''

''دو۔'' انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

''آپ کیا چاہتے ہیں۔ کیا میں کار کی رفتار اس حد تک بڑھا دوں کہ وہ ہماری گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ میں ان تینوں کو اپنے گھر تک لے جانا چاہتا ہوں۔ ان سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔''

''تو پھر لیجیے۔ میں اپنا کمال دکھاتا ہوں۔''

اس نے کہا اور رفتار بڑھانے لگا۔ انسپکٹر جمشید کو اس کی مہارت کا قائل ہونا پڑا۔ اب انہوں نے دیکھا کہ درمیانی فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''اب ہم ضرور بچ نکلیں گے۔'' وہ بولے۔

لیکن اچانک ڈرائیور کا سارا کمال دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ان کے سامنے سے اچانک ایک اور کار آ گئی تھی۔

ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے، ورنہ ان کی گاڑی اس کار سے ضرور ٹکرا گئی ہوتی۔ وہ ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ پچھلی کار بھی ان کے عین پیچھے آ کر رک گئی۔ وہ ترچھی رکی تھی اور اب ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی کو بیک بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے، آج یہ لوگ مجھے جان سے مار دینے کا لمبا چوڑا پروگرام بنا کر نکلے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

سامنے سے آنے والی کار میں بھی دو نوجوان بیٹھے تھے۔ ان کی گاڑی رکتے ہی وہ باہر نکل آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ انسپکٹر جمشید نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پچھلی کار سے بھی دو آدمی پسول لئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بیک وقت چار پستولوں کی زد پر تھے۔ اچانک انہیں یاد آیا ان کے پاس بھی دو پستول موجود ہیں۔ محمود نے چلتے وقت دشمنوں کا ایک پستول انہیں دیا تھا۔

انہوں نے ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی جو بت بنا کبھی انہیں اور کبھی ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔

''تم گاڑی کے اندر سیٹوں کے درمیان دبک جاؤ۔ ان لوگوں کو تم سے کوئی غرض نہیں ہے، یہ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔''

ڈرائیور نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا، لیکن انسپکٹر جمشید کے چہرے پر خوف و ہراس کی بجائے ایک دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ان کے تینوں قیدی بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔

''پہلے ہمیں کھولو۔ اس طرح ہم سات ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک آدمی انہیں کھولے، باقی تین انسپکٹر صاحب پر نظر رکھیں گے۔'' یہ ان ساتوں کا سردار جبر تھا۔

''اس کے پاس دو پستول ہیں۔'' تینوں میں سے ایک نے بتایا۔

''فکر نہ کرو۔ اس نے ذرا بھی جنبش کی اور ہمارے پستولوں سے گولیاں نکلیں۔''

''کیوں نہ ہم اس ٹیکسی ڈرائیور کو جانے دیں۔''

''نہیں۔ یہ پولیس کو خبر کر دے گا۔ ہم اپنا کام ختم کرنے کے بعد یہاں سے جائیں گے، یہ ہمارے بعد جائے گا۔''

''اس نے ہماری شکلیں دیکھ لی ہیں، کیوں نہ اسے بھی ختم کر دیں۔''

''نہیں۔ ہماری دشمنی انسپکٹر جمشید سے ہے اور پھر استاد کا حکم صرف اس کے لئے ہے۔''

''تمہارے استاد کا نام کیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے پہلی مرتبہ پوچھا۔

''اب چونکہ تمہاری زندگی چند گھڑیوں کی رہ گئی ہے اس لئے بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، ہمارے استاد کا نام استاد اعظم خان ہے۔''

''اوہ!'' انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے کیونکہ استاد اعظم خاں شہر کا سب سے بڑا غنڈہ سمجھا جاتا تھا لیکن آج تک کسی کو جان سے مار دینے کی واردات

میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا تھا۔ اس کا کام تھا، نشہ آور چیزیں فروخت کرنا۔ انہیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ اُستاد اعظم خاں ان کا دشمن کس لئے بن گیا ہے۔

"کیا استاد اعظم خاں نے ہی تمہیں اس جرم پر آمادہ کیا ہے۔"

"ہاں!" جبرو بولا۔

"بہت خوب! اب پھر تم اپنے اُستاد کا حکم بجالاؤ، میں اپنے خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ایک ساتھ ان پر فائر کرنا ہے، میں ایک دو تین گنوں گا۔ تین پر ساتوں گولیاں انسپکٹر جمشید کے جسم کے پار ہونی چاہیے۔ آج ہم اپنے سب سے بڑے دشمن کا قصہ پاک کر رہے ہیں، آج کے بعد ہمیں اس شہر میں ٹوکنے والا کوئی نہ ہوگا، ہم من مانی کرتے پھریں گے۔ آج کے بعد اس شہر میں خوب شراب بکے گی، چرس اور افیون شارع عام پر فروخت ہوگی۔ اب تو ہم غنڈہ ٹیکس بھی وصول کریں گے۔" جبرو جوش کے عالم میں کہتا چلا گیا، پھر ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر بولا۔

"ایک!"

ان کے پستول تن گئے۔ چہروں پر سختی کے آثار نمودار ہوگئے۔ آنکھیں انسپکٹر جمشید کے چہرے پر گڑ گئیں۔ اس وقت جبرو نے کہا۔

"دو!"

ان کی انگلیاں پستولوں کے ٹرائیگروں پر جم گئیں۔ اب موت اور زندگی میں ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اچانک انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"تمہارے سات ساتھی کیا کم تھے، کہ تم بھی چلے آئے۔"

یہ فقرہ انہوں نے پُرسکون انداز میں ایک دم کہا تھا۔ وہ ساتوں چونک کر مڑے اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا انسپکٹر جمشید کو انتظار تھا۔ وہ فوراً زمین پر گر گئے اور لڑھکتے ہوئے ٹیکسی کے نیچے گھس گئے، ساتھ ہی انہوں نے وہ پستول نکال لیا جو محمود نے انہیں دیا ہوا تھا۔ اسے نکالتے ہی انہوں نے ان پر فائرنگ کردی۔ ان میں سے کئی کے منہ سے چیخیں نکلیں۔ کئی کے ہاتھوں سے پستول اچھل کر گرے اور وہ سب بوکھلا کر اِدھر اُدھر پناہ لینے کے لئے دوڑے۔

عین اس وقت جب وہ پناہ لینے کے لئے دوڑ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید چپکے سے دوسری طرف رینگ گئے اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر سر جھکا کر اس میں داخل ہوگئے۔ ٹیکسی کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ انہوں نے جھکے جھکے ایک دم ٹیکسی چلا دی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ ٹیکسی لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اچانک ان میں سے ایک کو ہوش آیا اور اس نے اندھا دھند ایک فائر ٹیکسی پر جھونک مارا۔ انہوں نے ٹیکسی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹنے کی آواز سنی۔

☆☆

فرزانہ میز پر رکھے پارسل کو گھورے جارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ملاقاتی سے کیا باتیں کرے۔ آخر کہنے لگی۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس پارسل میں ہے کیا۔"

"بیٹی! یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"جی...... کیا مطلب؟"

"ہاں بیٹی۔ اس پارسل کی کہانی بھی عجیب ہے اور میں یہ کہانی تمہارے والد کے سامنے ہی سناؤں گا۔" اس نے کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے۔''

''بیٹی! لوگ مجھے سردار کابلی والا کہتے ہیں۔''

''جی!!'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے سردار کابلی والا کے متعلق بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ پورے ملک میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے افسروں سے تھے۔ اگر کبھی وہ کسی دفتر میں چلا جاتا تو دفتر کے تمام آفیسر اپنی کرسیوں سے بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے پاس یوں تو کوئی اختیارات نہیں تھے لیکن پھر بھی جو چاہتا، کر سکتا تھا۔ فرزانہ کو حیرت اس بات پر بھی ہوئی کہ سردار کابلی والا کو خود پارسل لے کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی وہ حیران ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

''معاف کیجئے! میں دیکھ آؤں، کون آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹی!'' سردار کابلی والا نے کہا۔

فرزانہ باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ اس کی امی اس سے پہلے دروازے کی طرف بڑھ چکی تھیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔ اتنی دیر میں بیگم جمشید دروازہ کھول چکی تھیں۔ دروازے پر انسپکٹر اکرام کھڑا تھا اس کے پیچھے تین کانسٹیبل بھی تھے۔

''خیریت تو ہے۔ آپ دونوں کافی پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔''

ہاں اکرام بھائی ہم بہت پریشان ہیں۔ ابھی تک محمود اور فاروق گھر نہیں آئے ہیں ان کے والد۔ نہ جانے وہ کہاں رہ گئے ہیں، اوپر سے کوئی شخص ان سے ملنے کے لئے آیا بیٹھا ہے۔''

''ہوں۔ پہلے میں چل کر اس ملاقاتی سے معلوم کر لوں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔'' اکرام نے کہا۔

''یہ تو وہ بتا ہی چکا ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''کیا چاہتا ہے وہ۔؟''

''وہ ایک پارسل ابا جان کو دینا چاہتا ہے۔''

''تو وہ پارسل یہاں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔''

''اس پارسل میں کیا ہے، یہ اسے نہیں معلوم۔ پارسل اس تک کیسے پہنچا، یہ ایک کہانی ہے جو وہ ابا جان کو سنانا چاہتا ہے اور پارسل پر ایک جملہ لکھا ہے۔''

''جملہ۔ کیا مطلب؟'' اکرام نے چونک کر کہا۔

''جی ہاں اس پارسل پر موٹے لفظوں میں لکھا ہے۔ صرف انسپکٹر جمشید کے لئے۔''

''ہوں! خیر میں چل کر دیکھتا ہوں۔'' اکرام نے کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ فرزانہ بھی اس کے پیچھے تھی۔

جونہی اکرام کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار طاری ہو گئے۔ اس کے منہ سے گھبرائے ہوئے لہجے میں نکلا۔

''آپ!!'' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سردار کابلی والا کو دیکھے جا رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' سردار کابلی والا نے پوچھا۔

''جی میں۔۔۔جی میں انسپکٹر جمشید کا اسسٹنٹ ہوں۔'' اکرام ہکلانے لگا۔

''اوہ اچھا.....بیٹھو.....''

اکرام گھبراہٹ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''یہ ضرور ابا جان ہوں گے، میں دیکھتی ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف دوڑی۔ دوسری طرف سے بیگم جمشید دروازے پر پہنچیں۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں دھک سے رہ گئیں۔ دروازے میں انسپکٹر جمشید کھڑے تھے اور ان کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ کر گردن پر آرہا تھا۔ قمیض کا کالر خون سے تر ہو چکا تھا۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہوا۔'' بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

''ابا جان!'' فرزانہ چلائی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں، میرے سر میں شیشے کا کوئی ٹکڑا لگا ہے، جس سے معمولی سا زخم آگیا ہے۔ بیٹی تم فوراً اکرام کو یہاں آنے کے لئے کہو۔''

''وہ تو پہلے ہی یہاں موجود ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ کیا وہ ڈرائنگ روم میں ہے۔''

''جی ہاں!''

''اچھا! اسے میرے کمرے میں لے آؤ۔ میں وہیں چلتا ہوں۔''

''جی بہت بہتر۔'' فرزانہ ڈرائنگ روم کی طرف دوڑی گئی اور بیگم جمشید انہیں سہارا دینے کے لئے آگے بڑھ آئیں۔

''محمود اور فاروق بھی ابھی تک نہیں آئے۔ میں ان کی وجہ سے حد درجہ پریشان ہوں؟''

''فکر نہ کرو۔ وہ میرے ساتھ ہی تھے اور بخیریت ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے اپنے کمرے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

''ارے۔ تو آپ انہیں کہاں چھوڑ آئے۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سناؤں گا۔'' وہ بولے۔

بیگم جمشید نے انہیں بستر پر لٹا دیا اور ان کے زخم صاف کرنے لگیں۔ اسی وقت سب انسپکٹر اکرام اندر داخل ہوا اور گھبرا کر بولا!

''خیریت تو ہے سر!''

''ہاں! فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہے۔ تم یوں کرو کہ فوراً شمالی سڑک پر جیپ لے کر روانہ ہو جاؤ۔'' تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں۔''

''جی تین ہیں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھما دینا۔ اگر کوئی سڑک پر تمہیں روکنا چاہے تو فائرنگ کرتے ہوئے گزر جانا۔ آگے جا کر تمہیں ایک سیاہ کار اور میری موٹر سائیکل نظر آئے گی، وہیں محمود اور فاروق کھڑے ہوں گے۔ انہیں یہاں لے آؤ۔ جلدی کرو۔''

''بہت اچھا جناب۔۔۔ وہ۔۔۔ اندر۔۔۔'' اکرام کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں۔ اندر ڈرائنگ روم میں ایک صاحب آپ کے منتظر ہیں۔''

''تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔ اسے میں دیکھ لوں گا۔''

''جی بہت بہتر!'' اس نے کہا اور دوڑتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

''ہاں بیٹی! اب بتاؤ۔ اندر کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید نے فرزانہ سے پوچھا۔ اتنی دیر میں بیگم جمشید زخم صاف کر کے پٹی کر چکی تھیں۔ اس کام کی انسپکٹر جمشید نے انہیں خاص تربیت دی تھی۔

"اندر سردار کابلی والا موجود ہے۔" فرزانہ نے بتایا۔

"کیا!" انسپکٹر جمشید زخمی ہونے کے باوجود بستر سے اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

فرزانہ کے کان

"کیا تم نے سردار کابلی والا کہا تھا یا میرے کان بجے ہیں۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے یہی نام لیا تھا ابا جان۔ آپ ٹھیک سمجھے۔"

"حیرت ہے۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے، اسے مجھ سے کیا کام آپڑا۔"

"اس کے پاس ایک پارسل ہے، جو وہ آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔"

"پارسل!" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔ "ٹھہرو! میں خود ہی چل کر دیکھتا ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"مگر آپ زخمی ہیں۔" بیگم جمشید نے بے چین ہو کر کہا۔

"میرا زخم معمولی ہے، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ابا جان۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ آپ کا بازو پکڑ کر چلوں گی۔"

"اچھا آؤ۔" انہوں نے کہا۔

"دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''السلام علیکم سردار صاحب......''

''وعلیکم السلام۔ میں نے سنا ہے، تم زخمی ہو گئے ہو۔'' اس نے اٹھے بغیر کہا۔

''جی ہاں! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔ آپ فرمایئے۔'' آپ نے کیوں تکلیف کی ہے۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''معاملہ ٹیڑھا تھا اس لئے خود ہی آیا ہوں۔''

''بات کیا ہے۔''

''میں کل رات اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کوئی چیز میرے ہاتھوں میں تھما دی اور تیزی سے کہنے لگا۔ میرے پیچھے اس وقت ملک کے دشمن لگے ہیں تم اگر اس ملک اور قوم کے ہمدرد ہو تو یہ چیز انسپکٹر جمشید کے پاس پہنچا دینا۔ یہ ملک اور قوم کی امانت ہے۔ اتنا کہہ کر وہ باغ کے پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس چیز کو دیکھا۔ وہ ایک پارسل تھا اور وہ پارسل اس وقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ میں نہیں جانتا، اس میں کیا ہے، اور وہ کون تھا، میں نے تو اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے، یہ واقعی ملک اور قوم کی امانت ہو، تم تک پہنچا دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔''

''ہوں۔ میں آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں، آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی اور پھر انتظار بھی کرنا پڑا لیکن قائدے کی رو سے آپ کو اس پارسل کے ملنے اور مجھے پہنچانے کے بارے میں ایک تحریر لکھ کر مجھے دینی ہوگی، اس تحریر کی ایک نقل آپ اپنے پاس بھی رکھ سکتے ہیں۔ بصورت دیگر میں اسے لینے سے انکار بھی کر سکتا ہوں۔''

''بھلا مجھے ایسی تحریر لکھنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لایئے لکھ دوں۔'' سردار کابلی نے کہا۔

''بیٹی انہیں دو کاغذ دو۔'' انسپکٹر جمشید نے فرزانہ سے کہا۔

''جی اچھا۔'' فرزانہ نے اٹھ کر میز کی دراز سے سادہ کاغذ نکالے اور سردار کابلی والے کو دے دیئے اور وہ تحریر لکھنے لگے۔ دونوں کاغذوں پر لکھ لینے کے بعد اس نے وہ انسپکٹر جمشید کو دیئے۔ انہوں نے پڑھ کر دیکھا۔ سردار کابلی والا نے پورا واقعہ تفصیل سے لکھ دیا تھا اور نیچے اپنے دستخط بھی کر دیئے تھے۔

''ٹھیک ہے، ایک آپ اپنے پاس رکھ لیں، میں اس پر پارسل کی وصولی کے دستخط کر دیتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں اس کی ضرورت کیا ہے۔'' سردار کابلی والا نے کہا۔

''صرف قانونی کاروائی اور کچھ بھی نہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا۔ تو اب میں چلتا ہوں۔''

''بیٹی! تم نے انہیں کچھ پلایا بھی ہے۔''

''جی ہاں۔ میں پی چکا ہوں۔ ماشاء اللہ بڑی ذہین بچی ہے۔''

''شکریہ!''

''اس پارسل میں سے جو بھی کچھ نکلے، اشارتاً مجھے بھی بتا دینا، ورنہ میں اُلجھن میں رہوں گا۔''

''جی اچھا۔''

انسپکٹر جمشید اور فرزانہ اسے چھوڑنے باہر تک آئے۔ سردار کابلی والا کار میں بیٹھ کر رخصت ہونے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے اکرام جیپ لئے آ پہنچا۔

اس کے ساتھ محمود اور فاروق بھی کود کر اترے اور فرزانہ کی طرف دوڑے، لیکن انسپکٹر جمشید کے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر درمیان ہی میں ٹھٹک کر رک گئے۔ اکرام جیپ پر سے موٹر سائیکل اتروانے لگے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں۔'' محمود اور فاروق نے سردار کابلی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسی وقت اس کی کار روانہ ہو گئی۔

''ہاں! معمولی سا زخم ہے۔''

اسی وقت بیگم جمشید بھی اندر سے نکل آئیں۔ محمود اور فاروق ان سے چمٹ گئے۔ پھر سب اندر آئے۔

''آخر ہوا کیا تھا۔'' اکرام نے پوچھا۔ اس پر انسپکٹر جمشید نے سارا واقعہ دہرایا پھر اکرام سے بولے۔

''اور اب ہمیں تیزی سے کام کرنا ہے۔ مجرم اپنے سردار کا نام استاد اعظم خان بتا چکے ہیں، سب سے پہلے تو ہمیں اسے گرفتار کرنا ہے۔''

''لیکن ہم اُسے کس الزام کے تحت گرفتار کریں گے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اس کے ٹھکانے سے تمہیں اس وقت بھی چرس اور افیون کا بڑا ذخیرہ مل جائے گا۔ وہ اس گھمنڈ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا کہ ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں رکھتے۔''

''تو کیا میں جا کر اسے گرفتار کر لوں۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گا، وہ تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔''

''لیکن آپ زخمی ہیں۔''

''اگر میں گھر میں پڑا رہا تو مجرموں کو تیسرا حملہ کرنے کی مہلت مل جائے گی۔''

''ہوں! تو پھر چلیے۔''

ان کے جانے کے بعد فرزانہ نے محمود اور فاروق سے کہا۔

''اب تم اپنی کہانی سناؤ۔''

''ابا جان نے سنا تو دی۔''

''انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ تم وہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ یہ بات تو شاید انہیں خود بھی معلوم نہ ہو گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' فاروق بولا۔

''غلط تو میں کبھی کہا بھی نہیں کرتی۔'' فرزانہ اکڑ کر بولی۔

''اپنے منہ میاں مٹھو بننا تو کوئی تم سے سیکھے۔'' فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

''تو سیکھ لو۔ منع کس نے کیا ہے۔ لیکن پہلے ساری بات سناؤ، پھر سیکھنا۔''

دونوں نے پوری داستان سنا دی۔

''اب ادھر کی سنو۔ یہاں۔'' فرزانہ نے کہنا شروع کیا لیکن فاروق نے بات کاٹ دی۔

''کیا یہاں بھی کوئی کہانی موجود ہے۔''

''ہاں۔ ڈرائنگ روم میں ایک عدد پارسل موجود ہے۔''

''پارسل۔ کیا مطلب؟'' فاروق اور محمود ایک ساتھ چونک کر بولے۔

''تم دونوں پارسل کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ دیکھیے امی۔ یہ پارسل کا مطلب بھی نہیں جانتے، نہ جانے اسکول میں کیا پڑھتے رہتے ہیں۔''

''سیدھی طرح نہ بتاؤ گی۔''

''الٹی طرح بتانا تو خیر مجھے آتا ہی نہیں۔ اچھا سنو۔'' فرزانہ نے سردار کابلی والے کا آنا اور اس کے بعد کے واقعات سنا دیئے۔ دونوں نے حیران ہو کر یہ

کہانی سنی۔ آخر فرزانہ کے چپ ہونے کے بعد محمود اٹھتا ہوا بولا۔

"تو وہ شخص سردار کابلی والا تھا جسے ہم نے کار میں جاتے دیکھا تھا۔"

"تو آؤ۔ اس پارسل کو دیکھیں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ کہیں تم گڑبڑ نہ کر بیٹھو۔"

"کیسی گڑبڑ۔"

"کہیں تم اسے کھول کر نہ دیکھ لو۔ جب کہ وہ صرف ابا جان کے لئے ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"جی ہاں! ہم جانتے ہیں۔" فاروق جل کر بولا۔

تینوں ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔

☆☆

استاد اعظم خان سُرخ رنگ کے مکان کے اسی کمرے میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

"ہیلو۔ کون صاحب ہیں۔"

"استاد کا استاد!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اوہ۔ آپ ہیں سر۔"

"ہاں! آخر تم ناکام رہے۔"

"مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ میرے ساتوں آدمی دوسری مرتبہ بھی ناکام ہو چکے ہیں البتہ جبرو کا کہنا ہے کہ اس نے انسپکٹر جمشید پر آخری گولی چلائی ہے، وہ ٹیکسی کے شیشے کو توڑتی ہوئی سیدھی انسپکٹر جمشید کی طرف گئی تھی اور اس کا خیال ہے کہ اس نے انسپکٹر جمشید کو زخمی ضرور کر دیا ہے۔"

"اس سے کیا فائدہ۔ خیر، میں نے جو چکر چلایا ہے، وہ اسے نہیں بچ سکے

گا۔"

"اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات پریشان کر رہی ہے۔" اعظم خان نے کہا۔

"اور وہ کیا......"

"جس وقت میرے آدمیوں نے انسپکٹر جمشید کو کور کیا ہوا تھا، اس وقت اس نے ان لوگوں سے پوچھا تھا کہ انہیں کس نے اس کام پر لگایا ہے تو انہوں نے اس گھمنڈ میں کہ اب انسپکٹر جمشید ان کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا، میرا نام بتا دیا۔"

"تو کیا ہوا۔"

"آپ کے خیال میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہوا یہ ہے کہ انسپکٹر جمشید مجھے گرفتار کرنے کے لئے آتا ہی ہوگا۔"

"کیا اس نے تمہارے آدمیوں میں سے کسی کو گرفتار کر لیا ہے۔"

"جی نہیں۔"

"تب پھر وہ تمہیں گرفتار کیسے کر سکتا ہے، اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم نے اسکو مارنے کے لئے کچھ آدمی بھیجے تھے۔"

"اس کے پاس بیشک کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن یہاں افیون اور چرس کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کیا ہم اسے اس کے آنے سے پہلے کہیں اور منتقل کر سکتے ہیں، ہرگز نہیں کر سکتے، یہ کام کئی گھنٹوں کا ہے۔"

"ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تو تم ایسا کرو کہ یہاں سے فوراً فرار ہو جاؤ۔"

"اور منشیات کا ذخیرہ!"

"اس کی فکر چھوڑ دو۔ وہ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ لگتا ہے تو لگتا رہے، مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"جی بہت اچھا...... تو میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

"ہاں اور جہاں بھی جا کر چھپو...... مجھے اطلاع دے دینا۔"

"بہت اچھا باس...... میں ایک بات۔" اعظم خان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اس کی نظر دروازے کی طرف اُٹھ گئی تھی جہاں انسپکٹر جمشید، اکرام اور چند کانسٹیبلوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال کا رُخ اعظم خان کی طرف تھا۔ دوسری طرف اعظم خان کا استاد پوچھ رہا تھا۔

"ہیلو۔ کیا بات ہے۔ تم کچھ کہتے کہتے رُک کیوں گئے۔"

اس سے پہلے کہ اعظم خان فون میں کچھ کہتا یا ریسیور واپس رکھتا، انسپکٹر جمشید برق رفتاری سے آگے بڑھے اور اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے ابھی تک پوچھا جا رہا تھا۔

"ہیلو... ہیلو... اعظم خان تم خاموش کیوں ہو گئے۔ تم کچھ کہتے کہتے رُک کیوں گئے۔"

"اعظم خان کی زبان مجھے دیکھ کر گنگ ہو گئی ہے۔ میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں اور عنقریب تم تک بھی پہنچ جاؤں گا کیونکہ اس سازش کی تہہ تک دراصل تمہارا ہاتھ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"کون ہو تم!" دوسری طرف سے غرا کر پوچھا گیا۔

دوسری طرف سے فوراً ریسیور رکھ دیا گیا۔

☆☆

تینوں اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی میز پر وہ پارسل رکھا تھا۔ وہ اس کے نزدیک آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اس طرح اسے دیکھنے لگے جیسے تینوں بہت بڑے سائنس دان ہوں اور کسی چیز کا معائنہ کر رہے ہوں۔

"کیا میں اسے ہاتھ میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔" محمود نے پوچھا۔

"دیکھ لو تمہارے ہاتھ میلے تو نہیں ہیں۔ اگر میلے ہیں تو پہلے انہیں صابن سے دھو ڈالو۔" فاروق نے اس کا مذاق اڑایا۔

"مذاق چھوڑو...... ابا جان زخمی ہو چکے ہیں۔"

"ارے ہاں...... واقعی......"

"کیوں فرزانہ کیا خیال ہے، کیا میں اسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں؟" محمود نے پھر پوچھا۔

"میرا خیال ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"جو غلط بھی ہو سکتا ہے......" فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا غلط ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تمہارا خیال......"

"تم نے پھر مذاق کیا۔" محمود نے آنکھیں نکالیں۔

"اب نہیں کروں گا؟" فاروق نے اس طرح گھبرا کر کہا جیسے اُسے انسپکٹر جمشید نے ڈانٹا ہو۔

"ابھی تک ابا جان نے اسے ہاتھ نہیں لگایا؟" محمود نے پوچھا۔

"نہیں۔ البتہ انہوں نے اسے دیکھا ضرور ہے۔"

"ہوں۔ میں اسے اٹھا رہا ہوں۔ آخر دیکھیں تو سہی۔ اس میں ہے کیا۔"

"لیکن تم اسے کھول نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ صرف ابا جان کے لئے ہے۔" فرزانہ بولی۔

"وہ تو میں بھی اس پر لکھا ہوا پڑھ چکا ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے ہاتھ میں اٹھا کر ہم کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔"

''خیر......تم اسے اٹھالو۔''

محمود نے پارسل کو اٹھالیا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''یہ تو بہت ہلکا ہے۔ مگر اس میں کاغذات تو نہیں ہو سکتے۔''

''کیوں......خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ بہت ہلکا ہے، پھر تو ضرور اس میں کاغذات ہی ہوں گے۔ یہ ہے بھی چوکور۔'' فاروق بولا۔

''تاہم کاغذات کا وزن اتنا نہیں ہو سکتا جتنا اس کا ہے۔ لو تم بھی دیکھو۔''

محمود نے پارسل فاروق کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اسے ہاتھوں پر تول کر دیکھا اور بولا۔

''لو فرزانہ تم بھی دیکھو۔ محمود کا خیال ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''میرا بھی خیال ہے کہ اس میں کاغذات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔'' فرزانہ نے پارسل لینے کے بعد کہا۔

''اب سوال یہ ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ جس انداز میں یہ سردار کابلی والے تک پہنچا۔ اس سے تو یہی اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس میں ضرور کچھ خفیہ کاغذات ہوں گے۔ پارسل دینے والے نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ ملک اور قوم کی امانت ہے۔ ملک اور قوم کی امانت کوئی مفید معلومات ہی ہو سکتی ہیں۔ دشمن ملک کی کاروائیوں کی رپورٹ یا ان کے فوجی ٹھکانوں کی تفصیل یا کچھ نقشے وغیرہ۔ یہی چند چیزیں ہیں جو ملک اور قوم کی امانت ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں سے تو پارسل میں کوئی معلوم نہیں ہوتی۔''

''تو پھر آخر اس میں کیا ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''کیا اسے ہم کھول کر دیکھ لیں۔'' فاروق نے کہا۔

''کھول کر اسے سردار کابلی والا بھی نہیں دیکھ سکا۔ اسے ابا جان ہی

کھولیں گے۔''

''یہ الفاظ بھی عجیب ہیں۔ صرف انسپکٹر جمشید کے لئے۔ کیا ان الفاظ کو پڑھ کر ہر کوئی اسے کھول کر دیکھنا نہ چاہے گا۔ ان الفاظ نے کس قدر تجسس پیدا کر دیا ہے۔ اگر اس جملے کے ساتھ صرف کا لفظ نہ ہوتا تو ہم بھی اس پارسل کی طرف توجہ نہ دیتے۔'' محمود بولتا چلا گیا۔

''تم غلط کہتے ہو۔ جس انداز میں یہ ہم تک پہنچا ہے، ان حالات میں اگر صرف کا لفظ نہ ہوتا تو بھی ہم اسے کھول کر دیکھنے کے لئے اتنے ہی بے چین ہوتے اور اس صورت میں ہم اسے کبھی کا کھول چکے ہوتے۔'' فاروق نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ فاروق ٹھیک کہتا ہے۔''

پارسل اس وقت فرزانہ کے ہاتھ میں تھا، اس نے اسے بے خیالی میں کان سے لگا کر دیکھا۔ چند لمحے وہ اسے کان سے لگائے رہی پھر کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں بہت ہلکی سی ٹِک ٹِک کی آواز آ رہی ہو۔''

''کیا۔ ذرا مجھے دکھانا۔'' محمود نے بے چین ہو کر کہا اور پارسل فرزانہ کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ چند لمحے تک وہ بغور سننے کی کوشش کرتا۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''تمہارے کان بجے ہوں گے۔ اس میں سے تو کوئی آواز بھی نہیں آ رہی ہے۔''

''لاؤ! میں دیکھتا ہوں۔'' فاروق نے کہا اور پارسل کان سے لگا لیا۔ وہ بھی تقریباً ایک منٹ تک کان سے لگائے سننے کی کوشش کرتا رہا، اور پھر بولا۔

''تم اپنے کانوں کا علاج کرواؤ۔ ان میں سے میل نکلوا اور ہر روز رات کو

سوتے وقت ان میں تیل ڈالا کرو، ویسے کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھانا سب سے بہتر رہے گا۔ کیونکہ خود علاج کرنا خطرناک ہوتا ہے۔ کیوں محمود کیا خیال ہے۔'' فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک خیال ہے۔ اس کے کان بیکار ہو چکے ہیں۔''

''میں ابھی امی جان کو دکھا کر آتی ہوں۔ ان کے کان تو تم جانتے ہی ہو، بہت تیز ہیں۔''

''کان تو تمہارے ان سے بھی تیز ہیں لیکن اس وقت خراب ہو چکے ہیں۔''

''خیر خیر۔ اس کا فیصلہ امی جان کریں گی۔''

تینوں بیگم جمشید کے پاس آئے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ''امی جان! ذرا اس پارسل کو کان سے لگا کر دیکھئے۔ کیا اس میں سے کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں آ رہی۔'' فرزانہ بولی۔

بیگم جمشید نے حیران ہو کر پارسل کو دیکھا، پھر بولیں۔

''تم اسے کیوں اٹھا لائے، جانتے نہیں یہ صرف تمہارے ابا جان کے لئے ہے۔''

''ہم جانتے ہیں امی اسی لئے ہم نے اسے کھولا نہیں۔ فرزانہ کا خیال ہے کہ اس میں سے ٹِک ٹِک کی آواز آ رہی ہے۔''

''اچھا!'' بیگم جمشید نے حیران ہو کر کہا اور پارسل لے کر کان سے لگا لیا۔ کافی دیر تک وہ اسے کان سے لگائے رہیں، پھر بولیں۔

''مجھے تو اس میں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔''

''دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔'' فاروق چہکا۔

''کیا کہا تھا تم۔'' بیگم جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہی کہ فرزانہ کو اپنے کانوں کا علاج کرا لینا چاہیے۔''

''لائیے امی! میں ایک بار پھر دیکھتی ہوں۔'' فرزانہ نے جھنجھلا کر کہا۔

اس بار وہ دو منٹ تک پارسل کانوں سے لگا کر دیکھتی رہی اور آخر کار بولی۔

''میرے کان بالکل ٹھیک ہیں اور اس میں سے ٹِک ٹِک کی آواز آ رہی ہے۔''

☆☆☆

پارسل میں بم

دوسرے دن اتوار تھا۔ گزشتہ رات کو انسپکٹر جمشید بہت دیر سے لوٹے تھے۔ اس وقت محمود فاروق اور فرزانہ سو چکے تھے۔ صرف بیگم جمشید جاگتی رہی تھیں۔ وہ واپس آئے تو بہت تھکے ہوئے تھے، آتے ہی لیٹ گئے۔ بیگم جمشید نے انہیں پارسل یاد دلایا تو وہ بولے۔

''اب صبح دیکھوں گا۔''

رات انہوں نے استاد اعظم خان کو تو گرفتار کر ہی لیا تھا، پھر جب اسے امتحان گاہ میں بجلی کی کرسی پر بٹھایا گیا تو اس نے اپنے ساتوں آدمیوں کے پتے بتا دیے لیکن وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس کا اپنا استاد کون ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اسے فون پر حکم دیتا ہے اور ہر ماہ گھر بیٹھے تنخواہ بھیج دیتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ اسے تنخواہ کیسے ملتی ہے، اس نے بتایا کہ اسے ایک رجسٹرڈ لفافہ ملتا ہے، جس میں سو سو روپے والے نوٹ ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نامعلوم آدمی نے انسپکٹر جمشید کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا اور چرس اور افیون کا سارا کام اس کے حکم کے مطابق چلتا ہے۔

بعد میں اس کے ساتوں ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا، جنہوں نے اقبال کر لیا کہ انہوں نے انسپکٹر جمشید پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور یہ اپنے استاد اعظم خان

کے حکم پر کیا تھا۔

رات کے تین بجے ان کی واپسی ہوئی تھی۔ ایسے میں بھلا وہ پارسل کیسے کھول کر دیکھتے، وہ آتے ہی گہری نیند سو گئے۔

دوسرے دن اتوار تھا، اور اگرچہ وہ اتوار کے دن بھی صبح سویرے ہی اٹھ جانے کے عادی تھے لیکن تھکے ہوئے ہونے کی وجہ سے سوتے رہے۔ انہیں کسی نے جگایا بھی نہیں۔

دوسری طرف اخبارات میں کل کی تمام خبریں شائع ہو چکی تھیں۔ جہاں اور خبریں شائع ہوئی تھیں وہاں انسپکٹر جمشید کے زخمی ہونے کا بھی ذکر تھا اور یہ خبر ایسی تھی کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد اسے پڑھ کر اپنے اپنے گھروں میں ہرگز بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے اخبار پڑھتے ہی اندازہ لگا لیا اور اپنی امی سے کہہ دیا کہ انہیں چائے وغیرہ کا بندوبست کر لینا چاہیے۔

بیگم جمشید باورچی خانے میں مصروف تھیں اور یہ صحن میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی، فرزانہ گھنٹی سنتے ہی بولی:

''یہ ضرور پروفیسر انکل ہوں گے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ انکل رحمان ہیں۔'' فاروق بولا۔

''دروازہ تو جا کر کھولتے نہیں اور یہاں بیٹھے خیالی گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔'' محمود نے جل کر کہا۔ ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تو کیا سچ مچ کے گھوڑے دوڑائیں۔'' فاروق مسکرایا۔

''تم بھلا باز رہ سکتے ہو۔'' محمود نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔'' فاروق نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''کسے......؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

"محمود کو۔ ہر وقت جلا بھنتا رہتا ہے۔"

"تم جلے ہی ایسے کہتے ہو۔" فرزانہ نے بھی بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"تو کیا میرے جلے اسے جلا بھنا دیتے ہیں۔"

"ہاں۔ اور کیا۔"

"تب تو میرے جلے بہت کام کی چیز ہیں۔ ان سے تو چنے اور مکئی کے دانے بھی بھونے جا سکتے ہیں۔"

"لو اور سنو۔ اب دانے بھنے لگے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"جو تم کہو بھون دوں۔"

"بس چپ رہو۔ تمہاری باتیں زہر لگتی ہیں۔"

"اچھا۔ ابھی تو میری باتیں جلانے اور بھنانے کا کام کر رہی تھیں اب یہ زہریلی ہو گئیں۔"

اسی وقت محمود پروفیسر داؤد اور شائستہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا نا کہ یہ پروفیسر انکل ہوں گے۔" فرزانہ مسکرا کر بولی۔ پھر اچانک کہا۔

"انکل السلام علیکم۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"

"تم کیسی ہو شائستہ۔" فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ تم یہ سناؤ انکل کیسے ہیں۔"

"وہ۔ وہ تو بالکل ٹھیک ہیں۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"لیکن اخبار میں تو چھپا ہے کہ وہ زخمی ہو گئے ہیں۔"

"معمولی سا زخم ہے۔"

"خواہ کیسا ہی زخم ہو۔ وہ حضرت ہیں کہاں۔" پروفیسر داؤد نے غصے میں آ کر کہا۔

"سو رہے ہیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کہا۔ سو رہے ہیں۔ اس وقت تک۔"

"جی ہاں۔ رات تین بجے واپسی ہوئی تھی۔"

"ارے۔ تو کیا اخبار میں نامکمل کہانی شائع ہوئی ہے۔"

"جی ہاں! اس میں تو رات نو بجے تک کے واقعات ہیں۔ اس کے بعد وہ مجرموں کو گرفتار کرنے بھی گئے تھے۔"

"زخمی ہونے کے باوجود!" پروفیسر داؤد غصے سے چلائے۔

"جی ہاں!"

"تمہارے باپ کا دماغ درست کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ ابھی کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ بیگم جمشید بھی وہاں آ گئیں اسی وقت دروازے کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔

"یہ ضرور انکل رحمان ہوں گے۔" محمود کے منہ سے نکلا اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔

محمود کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس مرتبہ خان رحمان اپنے تینوں بچوں کے ساتھ آئے تھے۔ وہ انہیں بھی لے کر اندر آ گیا۔

"ہائیں۔ آپ بھی آ چکے۔" خان رحمان نے پروفیسر داؤد کو دیکھتے ہی کہا۔

"اگر تم آ سکتے ہو تو کیا میں نہیں آ سکتا۔" پروفیسر داؤد نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن بارات کا زخمی دولہا کہاں ہے۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ ابھی سو رہے ہیں۔" بیگم جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا یہ سونے کا وقت ہے۔" خان رحمان جھلا کر بولے۔

"رات کو تین بجے آئے تھے۔"

"کیا کہا...... تین بجے...... بہت نالائق ہے یہ...... زخمی ہوتے ہوئے بھی آرام نہیں کرتا۔"

"آرام تو کر رہے ہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"بیٹا بڑوں سے مذاق نہیں کیا کرتے۔" خان رحمان ہنسے۔

"جی اچھا۔" فاروق نے ایسے سعادت مندانہ لہجے میں کہا کہ سب کو ہنسی آگئی۔ اسی وقت ایک آواز ان سب کے کانوں سے ٹکرائی۔

"یہ کیا ہنگامہ ہے۔ کیسا شور شرابہ ہے۔"

وہ چونک کر مڑے۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید کھڑے آنکھیں مل رہے تھے۔ ان کے سر پر ابھی تک پٹی بندھی تھی۔

"یہ لو۔ اب ہم ہنگامہ ہوگئے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اور شور شرابا بھی!" خان رحمان نے ٹکڑا لگایا۔

"ارے آپ لوگ ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے زبردست حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"شکر ہے کہ تمہاری آنکھیں تو کھلیں۔" خان رحمان نے جل کر کہا۔

"تو میری آنکھیں بند کب تھیں۔"

"بس بس ختم کرو۔ سیدھی طرح یہاں آکر بیٹھ جاؤ اور رات کے واقعات تفصیل سے سناؤ۔"

"کیوں۔ کیا اخبار میں نہیں پڑھے۔"

"اخبار میں تو پڑھ چکے ہیں، ہم تمہاری زبانی سننا چاہتے ہیں اور اس کے بعد کے واقعات بھی۔"

"اچھا سناتا ہوں۔ مگر پہلے مجھے کچھ کھا تو لینے دو۔"

"تو اکٹھے ہی کھا لیتے ہیں۔" خان رحمان کی بات پر سب مسکرا دیئے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر انسپکٹر جمشید نے انہیں ساری کہانی سنا دی۔ اچانک فرزانہ کو کچھ خیال آیا۔

"اور ابا جان! آپ نے پارسل والی بات تو بتائی ہی نہیں۔"

"پارسل۔ ارے ہاں اسے تو میں بھول ہی گیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پارسل۔ کیسا پارسل۔" پروفیسر داؤد چونک کر بولے۔

اب انہیں اس پارسل کے متعلق بھی بتانا پڑا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

"اچھا۔ بیٹی ذرا اسے اندر سے اٹھا لانا۔"

فرزانہ پارسل اٹھا لائی۔ پروفیسر داؤد نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور کافی دیر تک دیکھنے کے بعد کہنے لگے۔

"میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے ہرگز نہ کھولنا۔"

"کیوں؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔ باقی لوگ بھی پروفیسر داؤد کو گھورنے لگے۔

"ابا جان! کل فرزانہ کو اس میں سے ٹِک ٹِک کی آواز سنائی دی تھی۔" فاروق بول اٹھا۔

"کیا!!" پروفیسر داؤد چلائے ساتھ ہی انہوں نے پارسل کو کان سے لگا لیا۔ کافی دیر تک وہ کچھ سننے کی کوشش کرتے رہے، لیکن پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے کان سے ہٹا لیا۔

"لایئے! میں دیکھتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پھر تو سب نے ہی باری باری اسے کان سے لگا کر دیکھا مگر کسی کو ٹِک ٹِک کی آواز سنائی نہیں دی۔ آخر میں فرزانہ نے دیکھا اور بولی۔

''مجھے تو اب بھی ٹِک ٹِک کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

''تمہارے کان یقیناً خراب ہو چکے ہیں۔'' بدلوانے پڑیں گے۔'' فاروق نے ناک چڑھا کر کہا۔

''آپ نے کس خیال کے تحت کہا تھا کہ میں اسے نہ کھولوں۔'' انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''اس کا وزن دیکھ کر۔''

''کیا اس میں کوئی خطرناک چیز ہو سکتی ہے۔''

''ہاں! اس کا امکان ہے۔''

''تو پھر کیسے یقین کیا جائے، کہ اس میں کوئی خطرناک چیز ہے۔''

''میں اسے اپنے ساتھ لیبارٹری میں لے جاتا ہوں۔ وہاں بعض آلات کی مدد سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی خطرناک چیز ہے یا نہیں۔''

''تب تو ہم سب آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' خان رحمان بولے۔

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''تو پھر چلو۔''

یہ چھوٹا سا قافلہ پروفیسر داؤد اور خان رحمان کی کاروں میں لیبارٹری کی طرف روانہ ہوا۔

☆☆

پروفیسر داؤد نے پارسل کو ایک مشین میں رکھا۔ اس مشین کے تار لاؤڈ اسپیکر سے جوڑے اور بجلی کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں آواز

گونجنے لگی۔

''ٹِک ٹِک!'' وہ سب اس آواز کو سن کر چونک اٹھے۔

پروفیسر داؤد نے سوئچ آف کر کے پارسل مشین سے نکال لیا اور مسکرائے۔

''فرزانہ کے کان ہم سب سے تیز ہیں!''

''اور اب محمود اور فاروق کو اپنے کان بدلوا لینے چاہیے۔'' فرزانہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اُف میرے خدا۔ آخر اس پارسل میں ہے کیا۔''

''اس پارسل میں۔ پروفیسر داؤد کہتے کہتے رک گئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔'' ایک بار پھر بتاؤ، یہ تم تک کیسے پہنچا ہے۔''

''بتا تو چکا ہوں۔''

''میرا مطلب ہے، سردار کابلی والا کے پاس کس طرح پہنچا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے ایک بار پھر تفصیل سے سارا واقعہ دہرایا۔

''تم پر کل دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔''

''ہاں!''

''وہ شخص، جس نے یہ حملہ کرایا ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ تم معمولی آدمی نہیں ہو، اور آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہو۔ اس لئے اس نے ایک چھوڑ تین تین انتظامات کئے ہیں۔ پہلے تین آدمیوں سے حملہ کرایا۔ پھر چار آدمیوں کے ذریعے تمہیں گھیرا گیا۔ لیکن تم دونوں مرتبہ بچ نکلے۔ شاید اسے پہلے سے ہی اُمید تھی کہ تم ان حملوں سے بچ نکلو گے۔ اس لئے اس نے ایک تیسرا انتظام کیا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے فرزانہ کے کانوں کو عام لوگوں کے کانوں کی نسبت زیادہ تیز بنایا ہے۔''

"کیا مطلب!" انسپکٹر جمشید نے چونک کر پوچھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم نے پارسل میں سے نکلنے والی ٹک ٹک اپنے کانوں سے سن لی ہے۔ جانتے ہو، اس مشین نے آواز کو کتنے گنا بلند کر دیا ہے۔"

"کتنے گنا؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک لاکھ گنا!"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"آخر اس میں ہے کیا۔"

"بم!" پروفیسر داؤد نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"بم!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

"ہاں بم۔ اور بم بھی ایسا جس میں ٹائم فکس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جونہی اسے کھولا جائے گا یہ پھٹ جائے گا اور ساتھ ہی کھولنے والے کا سر اڑا دے گا۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

☆☆☆

تیمور کن کٹے کی موت

کئی منٹ تک ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ سب حیرت کا بت بنے اس پارسل کو تک رہے تھے۔

"اگر میں نہ پہنچ گیا ہوتا تو شاید تم اسے کھول ہی لیتے۔" پروفیسر داؤد نے سکوت کو توڑا۔

"ہاں۔ شاید!" انسپکٹر جمشید یہ کہہ کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اچانک انہیں کوئی خیال آیا۔ انہوں نے پاس رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائیل کرنے لگے۔

"ہیلو۔ کون صاحب۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی میں۔ انسپکٹر جمشید ہوں۔"

"کیا بات ہے انسپکٹر صاحب!"

"کیا آپ سردار کابلی والا ہیں۔"

"بالکل ہوں۔"

"آپ سے ایک بات پوچھنا بھول گیا۔ اس آدمی کا حلیہ کیا تھا جو پارسل لئے برانچ میں داخل ہوا تھا۔"

"حلیہ۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور دائیں کان کی لو کٹی ہوئی تھی۔"

"کیا فرمایا۔ داہنے کان کی لو کٹی ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں!"

"بہت بہت شکریہ!" انہوں نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز سن کر سلسلہ منقطع کر کے جلدی جلدی اکرام کے نمبر ڈائیل کرنے لگے۔

"ہیلو اکرام۔ غور سے سنو۔ فوراً کچھ آدمیوں کو لے کر تیمور کن کٹے کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ میں پروفیسر داؤد کے ہاں سے بول رہا ہوں۔"

"جی بہت بہتر!"

"دیر ہرگز نہ کرنا۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔"

"میں اسی وقت روانہ ہو رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا معاملہ ہے۔" خان رحمان نے پوچھا۔

"جس آدمی نے پارسل سردار کابلی والا کو دیا تھا، اس کے حلیے کا ایک آدمی بہت عرصے سے ہماری لسٹ پر ہے، میں نے اُسے بلوایا ہے۔"

"ہوں۔ معاملہ لمحہ بہ لمحہ پُراسرار ہوتا جا رہا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آخر وہ کون ہے۔ جس نے اس بم کے ذریعے تمہیں ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔" خان رحمان نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"یہی بات تو معلوم کرنی ہے۔"

"انسپکٹر جمشید بولے اور کسی سوچ میں گم ہو گئے۔"

"کیا میں اس بم کو محفوظ کر دوں۔"

"کیا یہ کھولے بغیر بھی پھٹ سکتا ہے۔"

"نہیں۔"

"تب پھر اسے یہیں رہنے دیں، کیونکہ جس آدمی کا میں منتظر ہوں، اسے یہ پارسل دکھانا ہے۔"

"اچھا۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اپنی اپنی جگہ ہر شخص سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اکرام مطلوبہ آدمی کو لے کر وہاں پہنچا۔

"لیجئے جناب۔ یہ حاضر ہے۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں انسپکٹر صاحب! مجھے کس لئے پکڑ کر بلوایا گیا ہے۔" تیمور کن کٹے نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہاں ضرور پوچھ سکتے ہو...... تمہارے سامنے میز پر ایک چیز رکھی ہے۔ کیا اسے پہچانتے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے پارسل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تیمور کن کٹا پارسل کی طرف مڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ بس کھڑا پارسل کو تکتا رہا۔

"تم نے جواب نہیں دیا مسٹر تیمور۔ کیا اس پارسل کو پہچانتے ہو۔"

"نہیں۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو، کیا یہ تم نے سردار کابلی والا کو یہ کہہ کر نہیں دیا تھا کہ تمہارے پیچھے دشمن ملک کے جاسوس لگے ہیں اور یہ ملک و قوم کی امانت ہے۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"تب پھر مجھے سردار کابلی والا کو یہاں بلانا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید اسے گھورتے ہوئے بولے اور فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ابھی نمبر گھمانے ہی لگے تھے کہ تیمور بول اٹھا۔

"رہنے دیجئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ پارسل میں نے ہی سردار کابلی والا

کو دیا تھا۔"

"تمہیں ایسا کرنے کے لئے کس نے کہا تھا؟ دوسرے لفظوں میں آج کل تم کس کے لئے کام کر رہے ہو؟"

"میں اسے نہیں جانتا۔"

"تم ایک دم بکواس کر رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں جانتے تو یہ پارسل کیا اس کے فرشتوں نے تمہیں دیا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے غصے میں آ کر کہا۔

"اس کے متعلق مجھے فون پر ہدایت ملی تھی۔"

"اور وہ ہدایت کیا تھی۔"

"اس نے بتایا تھا کہ مجھے ہوٹل تھری اسٹار کی کوڑے کرکٹ کی ٹوکری میں ایک پارسل ملے گا، اسے اٹھالینا اور کھول کر نہ دیکھنا، اس کے بعد اس نے مجھے ہدایت کی کہ اسی وقت اسے سردار کابلی والا کے مکان میں ان کے پاس پہنچادو۔ اور وہی کچھ کہہ دوں۔ جو میں نے بعد میں کہا۔"

"کیا اُس نے تمہیں یہ بھی بتایا کہ سردار کابلی والا تمہیں کہاں ملے گا۔"

"ہاں! اس نے کہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے باغ میں ٹہل رہا ہوگا۔"

"بہت خوب! ٹھیک ہے اکرام یہ حراست میں رہے گا، اسے لے جاکر حوالات میں بند کردو۔"

"جی بہتر!" اکرام اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیمور کن کٹے کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

"آخر وہ کون ہے۔" خان رحمان نے جھنجلا کر کہا۔

"اب مجھے یہی معلوم کرنا ہے استاد اعظم خان نے بھی یہی بتایا ہے کہ فون پر اسے احکامات ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ تیمور نے ٹھیک ہی بتایا ہے۔"

"آخر اس نے پارسل سردار کابلی والا کے پاس پہنچانے کے لئے

کیوں دیا۔" فرزانہ نے اچانک ایک سوال پوچھا۔

"انسپکٹر جمشید اس کا سوال سن کر چونک اُٹھے۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"اگر اس سوال کا جواب مل جائے تو وہ شخص ضرور روشنی میں آجائے گا، جس نے یہ ساری سازش تیار کی ہے۔"

"کیا تم ابھی تک اسے نہیں پہچان سکے۔"

"نہیں!" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں مایوسی تھی۔" لیکن وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا۔"

عین اسی وقت انہیں کوٹھی کے باہر فائرنگ کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ فضا میں گونجی۔ انسپکٹر جمشید اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑے۔

☆☆

باہر نکل کر انہوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ تیمور کن کٹا جیپ کی پچھلی سیٹ پر پڑا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور دور بہت دور سڑک پر کسی جاتی ہوئی کار کی سرخ بتیاں نظر آرہی تھیں۔ اکرام کھڑا اسے تڑپتے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اس پر گولی اس کار سے چلائی گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"پھر تم نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا۔"

"جیپ کی پچھلی سیٹ پر یہ تڑپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیسے جیپ دوڑا سکتا تھا۔"

"تم اسے زمین پر ڈال دیتے کیونکہ قاتل کے پیچھے جانا زیادہ اہم تھا۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی سر!"

''خیر کوئی بات نہیں اب سب سے پہلے اسے جلدی سے ہسپتال لے جاؤ۔ یہ ضرور مجرم کے متعلق کچھ جانتا ہے، اس لئے اس نے اسے ختم کر دیا۔ کیا یہ ہوش میں ہے۔''

''جی نہیں۔ میں نے اسے کئی آوازیں دیں، مگر اس نے نہیں سنا۔''

''تم فوراً اسے ہسپتال لے جاؤ۔ اور واپس آ کر بتاؤ کہ کیا ہوا تھا۔''

''جی اچھا۔''

اکرام اسے لے کر چلا گیا اور آدھ گھنٹے بعد واپس آ گیا۔

''وہ ہسپتال پہنچ کر ہی ختم ہو گیا۔''

''وہ کچھ بھی نہیں بتا سکا؟'' انسپکٹر جمشید نے مایوس ہو کر پوچھا۔

''مرتے وقت اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔''

''اور وہ کیا تھا۔'' انسپکٹر جمشید نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''رُکاب!''

''کیا مطلب۔ رکاب۔'' وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''جی ہاں۔ میں نے غور سے سنا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ لفظ اس کے منہ سے نکلا۔ اس کے لئے بھی اسے بہت محنت کرنی پڑی۔''

''خیر تم یہ بتاؤ کہ جب تم تیمور کن کٹے کو لے کر باہر نکلے تو یہ واقعہ کس طرح پیش آیا؟''

''میں اسے باہر لے کر نکلا، اسے پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھے ہی لگا تھا کہ ایک کار پیچھے سے آئی اور فائر کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔''

''تم نے فائر کرنے والے کو دیکھا۔''

''جی نہیں۔ اس نے کوٹ کے کالروں اور ہیٹ سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔''

''کار کا رنگ۔ نمبر۔''

''کار کا رنگ سفید تھا۔ کار شاید مرسڈیز تھی، میں اس کا نمبر نہیں پڑھ سکا۔''

''ہوں۔ اب غور سے سنو۔ تیمور کے پیٹ سے جو گولی ملے گی اسے میرے پاس لے آنا۔''

''جی اچھا۔''

''اور ہاں اس کالی کار کے متعلق کیا معلوم کیا، جس نے پہلی مرتبہ میرا پیچھا کیا تھا۔''

''وہ کار تو اعظم خان کی ہی ثابت ہوئی۔''

''بس تو ثابت ہو گیا کہ اعظم خان نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگائے تھے۔ کم از کم وہ تو اب بچ نہیں سکے گا۔''

''جی ہاں!''

''جاؤ۔ کہیں تیمور کے پیٹ میں لگنے والی گولی اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔''

''جی اچھا۔''

اکرام پھر وہاں سے چلا گیا۔ انسپکٹر جمشید کو بھی اب چونکہ پروفیسر داؤد کے ہاں کوئی کام نہ رہا تھا، اس لئے انہوں نے اجازت لی۔

خان رحمان بھی وہاں سے رخصت ہوئے۔ البتہ وہ پارسل پروفیسر داؤد کے پاس ہی رہنے دیا گیا، جنہوں نے اسے ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔

انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے خان رحمان کی کار میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ بچے پچھلی سیٹ پر تھے اور دونوں دوست اگلی سیٹ پر۔

‘‘تمہارے خیال میں یہ جان لیوا حملے کرانے والا کون ہے۔’’ خان رحمان نے پوچھا۔

‘‘خدا ہی کو معلوم ہے۔’’

‘‘کیا تم ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکے۔’’

‘‘ایک اندازہ لگایا تھا، تیمور کن کٹے کے مارے جانے پر وہ اندازہ بھی غلط ہو گیا۔’’

‘‘پھر اب تم کیا کرو گے۔ ظاہر ہے کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے، جو آدمی ایسے خطرناک حملے کرے، وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ پھر حملہ کرے گا۔’’

‘‘ہاں! میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن اس کے سب ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں، اور ایک مارا جا چکا ہے۔’’

‘‘تو تیمور کن کٹا بھی اس کا ساتھی تھا۔’’

‘‘بالکل۔ اسے ضرور کوئی خاص بات معلوم تھی۔ جب مجرم نے دیکھا کہ اسے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہے تو اسے خوف سا محسوس ہوا کہ وہ کہیں اس کا راز نہ ظاہر کر دے۔ ہو سکتا ہے یہ شخص مجرم سے واقف ہو اور۔۔۔۔۔’’

‘‘اور اس نے ہی پارسل اسے دے کر یہ کہا ہو کہ اسے سردار کابلی والے تک پہنچا دو اور ساتھ میں یہ کہانی بھی سنا دینا۔’’ خان رحمان بولے۔

‘‘ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے، تیمور کن کٹا، مجرم سے واقف تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اسے ختم کر دیا۔’’

‘‘ابا جان! کیا آپ ان دو کاروں کے نمبر نوٹ نہیں کر سکے تھے، جنہوں نے بعد میں آپ کو گھیرا تھا۔ فاروق نے سوال کیا۔

‘‘نہیں بیٹا! اتنی مہلت ہی کہاں ملی۔ اس وقت سات پستولوں کی نالیں

میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔’’

‘‘ہوں! لیکن ان دو کاروں کے بارے میں ان ساتوں سے ضرور معلوم کیا جا سکتا ہے۔’’

‘‘اوہ! واقعی۔ مجھے خیال نہیں رہا۔ رحمان کار کو پولیس اسٹیشن کی طرف لے چلو۔’’ انسپکٹر جمشید نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد استاد اعظم خان سے معلومات حاصل کرنے پر انسپکٹر جمشید کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ دونوں کاریں بھی استاد اعظم خان کے نام ہی تھیں۔ بعد میں ان کاروں پر قبضہ کر کے تفتیش بھی کی گئی اور کاریں استاد اعظم خان کی ہی ثابت ہوئیں۔

‘‘مجرم کتنا چالاک ہے۔ وہ خود تو کسی معاملے میں آیا ہی نہیں۔’’ انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

‘‘لیکن ابا جان۔ وہ ایک معاملے میں ضرور دخل دے چکا ہے۔’’ فرزانہ بولی۔

‘‘کونسا معاملہ بیٹی۔’’

‘‘تیمور کن کٹے کا معاملہ۔ اسے مارنے کے لئے تو وہ خود ہی آیا۔ فرزانہ نے جواب دیا۔

‘‘ہاں! اب مجھے اس گولی کا انتظار ہے، جو اکرام لینے گیا ہے۔’’ انسپکٹر جمشید نے کہا اور کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

کھلی کھڑکی

ان تینوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سخت پریشان تھے کیونکہ کوئی نامعلوم آدمی ان کے والد کی جان لینے پر تلا ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے والد کے لئے کیا کریں۔ اس وقت بھی وہ ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے اور رات گزرتی جا رہی تھی۔

انسپکٹر جمشید کو وہ گولی دوپہر سے پہلے ہی مل چکی تھی، لیکن بھلا وہ اس گولی سے مجرم تک کس طرح پہنچ سکتے تھے جب تک کہ وہ پستول نہ مل جاتا، جس سے گولی چلائی گئی تھی۔

''میں نہیں سمجھ سکتی کہ ابا جان مجرم تک کیسے پہنچیں گے، ان کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''پستول کی گولی مجرم کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''وہ کیسے۔''

''جب کسی پستول سے گولی چلائی جاتی ہے تو اس پر کچھ نشانات پڑ جاتے ہیں، ہر پستول سے چلائی جانے والی گولی پر دوسری گولیوں سے مختلف نشانات

پڑتے ہیں، ایک پستول سے چلنے والی گولی کے نشانات کبھی کسی دوسرے پستول سے چلنے والی گولی کے نشانات سے نہیں ملتے۔ اب اگر ہمیں قاتل کا پتا چل جائے اور ہم اس کا پستول حاصل کر کے اس سے ایک گولی چلائیں تو اس گولی کے نشانات تیمور کن کٹے کے جسم سے ملنے والی گولی کے نشانات کے عین مطابق ہوں گے اور اس طرح جرم ثابت ہو جاتا ہے۔'' فاروق نے بتایا۔

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں وہ پستول مل جائے۔ جبکہ قاتل اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔'' محمود نے اعتراض کیا۔

''ہاں! اور اب اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم کس پر شک کریں اور اس کے گھر کی تلاشی لیں۔''

''اور یہ بہت مشکل کام ہے۔ آخر ہم اس بھرے پُرے شہر میں کس پر شک کریں۔ ابا جان کے دشمن تو نہ جانے کتنے ہوں گے۔''

''پھر بھی ابا جان نے کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کیا ہوگا۔''

''تو پھر ان کی نظر میں پستول کی گولی والا مسئلہ بھی ضرور ہوگا۔''

''ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''تب پھر کیا کیا جائے۔''

''میرا خیال ہے سویا جائے۔ کیونکہ یہ معاملہ ہمارے اختیار سے باہر ہے۔''

''ابا جان اور امی جان اس وقت تک یقیناً سو چکے ہوں گے، کیوں نہ ہم مکان کا ایک چکر لگا لیں۔'' فرزانہ نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''میں یہ سمجھتی ہوں کہ مجرم کی پے در پے ناکامیوں نے اس کے غصے کی

آگ کو بہت بھڑکا دیا ہوگا اور غصّے میں آدمی عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے...... کہیں وہ......" فرزانہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"کہیں وہ یہاں حملہ کرنے نہ آئے۔ تم یہی کہنا چاہتی ہو۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"ہاں!"

"کیا یہ خیال ابا جان کو نہ آیا ہوگا۔"

"انہوں نے سوچا ہوگا کہ اتنی ناکامیوں کے بعد اب وہ کیا حملہ کرے گا۔"

"تو پھر۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ اس طرف آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔" فاروق نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن ایک چکر لگا لینے میں کیا حرج ہے۔"

"تمہارا دماغ تو چکر نہیں کھا رہا ہے۔" فاروق جل کر بولے۔

"ابھی تو نہیں کھا رہا ہے۔ اگر کھانے لگا تو تمہیں بتا دونگی۔"

"میرا خیال ہے۔ فرزانہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے، آؤ فاروق چلو۔"

تینوں کمرے سے نکلے۔ یہ کمرہ وہی تھا جس کی کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے انہیں کھڑکی بند کرنے کا خیال نہیں رہا۔ جونہی وہ تینوں کمرے سے نکلے۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں داخل ہوگیا۔

انہوں نے پہلے تو سارے مکان کا اندرونی حصّہ دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ مکان کے گرد ایک چکر لگایا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چل کر سو جانا چاہیے۔" فرزانہ بولی۔

"شکر ہے، تمہیں بھی کوئی ڈھنگ کا خیال آیا۔" فاروق نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

"ہاں۔ کوئی خطرے والی بات معلوم نہیں ہوتی۔" محمود بولا۔

"تو آؤ۔ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔"

تینوں اندر داخل ہوئے، چٹخنی لگائی اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے مڑے۔

"ایک بار ابا جان کے کمرے کو دیکھ لیں۔" فرزانہ رکتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہم نے پورے مکان کا چکر ضرور لگایا ہے لیکن چونکہ ابا جان کے کمرے کا دروازہ بند تھا، اس لئے اسے نہیں دیکھا۔" فرزانہ نے کہا۔

"تو پھر۔ اب ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اچھا آؤ۔ تم سے زیادہ وہمی بھی کوئی نہ ہوگا۔" فاروق بولا۔

اور تینوں اپنے ابا جان اور امی جان کے کمرے کے دروازے کی طرف آگئے۔ انہوں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف آئے۔ شیشے مں سے اندر جھانکنا چاہا لیکن بجلی کا بلب بجھا ہوا تھا، اس لئے کچھ نہ دیکھ سکے، لیکن چونکہ اندر مکمل طور پر خاموشی تھی اس لئے سب خیریت سمجھ کر واپس اپنے کمرے کی طرف مڑے۔

فاروق جھنجھلایا ہوا تھا۔

"بلاوجہ ہی اتنی دوڑ دھوپ کی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"چلو بلاوجہ ہی سہی۔ اب بے فکری سے سو تو سکیں گے۔"

''رات کافی گزر چکی ہے، اب کیا نیند آئے گی۔'' فاروق بولا۔

''تو کیا تم بقیہ رات جاگ کر گزار دینا چاہتے ہو۔''

''اگر تم دونوں بھی میرے ساتھ جاگنے پر تیار ہو۔ تو۔''

''ہم تو ہرگز اپنی نیند خراب نہیں کریں گے۔'' محمود بولا۔

''تب پھر میں تم سے پہلے سو جاؤں گا۔''

تینوں باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان دنوں تینوں اس کمرے میں سوتے تھے۔ پہلے فرزانہ الگ سویا کرتی تھی لیکن پھر انسپکٹر جمشید نے احتیاط کے خیال سے اس کا بستر بھی انہی کے کمرے میں لگوا دیا تھا۔

''اس بار کا مجرم میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' فرزانہ اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''تمہاری سمجھ میں تو کسی بار کا مجرم بھی نہیں آتا۔''

''جی ہاں جیسے ہر بار مجرم کو تم ہی تو پکڑتے ہو۔'' فرزانہ نے جل کر کہا۔

''اس میں کیا شک ہے۔''

''اچھا بس۔ اب باتیں بند۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' محمود نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

اچانک فرزانہ کے منہ سے دہشت کی چیخ نکلی۔

''کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ دونوں گھبرا گئے۔ اور فرزانہ کی طرف دوڑے۔

فرزانہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی ایک سمت میں اٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی اُس سمت میں دیکھا۔ فرزانہ پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم بولتی کیوں نہیں۔ کیا بات ہے۔''

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔کھڑکی۔''

''کیا ہوا کھڑکی کو......''

''کھڑکی۔ جب ہم یہاں سے گئے۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند تھے۔ لیکن اب دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔'' فرزانہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہوا سے کھل گئے ہوں گے۔''

''لیکن آج ہوا بالکل بند ہے۔ باغ کا کوئی پتا تک تو ہلتا نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''اوہ!'' دونوں کے منہ سے نکلا۔ اب ان کی آنکھوں میں بھی خوف دوڑ آیا تھا۔

''تو کیا کوئی اندر داخل ہوا ہے۔'' فاروق کے منہ سے نکلا۔

''اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''اب ہم کیا کریں۔''

''ہمیں اندر چل کر دیکھنا چاہیے۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''اور ہم میں سے ایک کو گھر سے باہر جا کر دیکھنا چاہیے۔'' محمود نے کہا۔

''کیا مطلب۔ گھر سے باہر جا کر دیکھنے کی کیا ضرورت۔''

''دیکھنا یہ ہے کہ آنے والا کسی کار کے ذریعے آیا ہے، موٹر سائیکل کے ذریعے سے۔ یا پھر پیدل۔ اگر وہ کسی کار وغیرہ پر آیا ہے تو فوراً اس کے نمبر نوٹ کرنے چاہیے۔ تاکہ اگر مجرم کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو جائے تو ان نمبروں کے ذریعے اس تک پہنچا جا سکے۔''

''بہت خوب۔ تو میں باہر جا کر دیکھتا ہوں، تم دونوں ابا جان کے کمرے کی طرف جاؤ۔'' فاروق بولا۔

"ہمیشہ آسان کام خود سنبھالو گے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"یہ جلنے بھننے اور کڑھنے کا وقت نہیں ہے، کام کا وقت ہے۔" فاروق نے غصے میں آکر کہا اور کھڑکی کے ذریعے پائیں باغ میں کود گیا۔

عین اس وقت شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا۔

☆☆

فاروق کے ہاتھ میں پنسل اور کاغذ تھا۔ دونوں چیزیں اس نے جیب سے نکالی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ گھر کے دروازے کے آس پاس ہی کار کھڑی نظر آجائے گی لیکن خیال غلط نکلا۔ گھر کے آس پاس کوئی کار نہ تھی۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے ہی لگا تھا کہ ایک اور خیال آیا۔ اس نے سوچا، ہوسکتا ہے کہ مجرم نے اپنی کار یا موٹر سائیکل گھر سے کچھ دُور کھڑی ہو تا کہ اس کا نمبر نہ نوٹ کیا جاسکے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ گلی کے دوسرے سرے پر گیا ادھر بھی اسے کوئی کار یا موٹر سائیکل نظر نہ آئی، البتہ گلی کا موڑ مڑتے ہی سڑک کے کنارے پر ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے علاوہ دور تک کوئی کار وغیرہ نہیں تھی۔

اس نے سوچا۔ اگر یہ کار مجرم کی نہیں ہے تب بھی نمبر نوٹ کر لینے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ وہ جھکا اور کھمبے کے بلب کی روشنی میں کار کا نمبر نوٹ کر لیا۔ پھر اسے جیب میں رکھا اور اطمینان سے گھر کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ صدر دروازہ چونکہ اندر سے بند تھا اس لئے وہ پائیں باغ میں سے ہوتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چوکھٹ پر رکھے اور ایک چھلانگ لگا کر کمرے میں آگیا۔ کمرہ خالی تھا۔ محمود اور فرزانہ جا چکے تھے۔

اب وہ بھی اپنے والد کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں اسے محمود اور فرزانہ نہیں ملے جونہی وہ کمرے کے سامنے پہنچا۔ حیرت سے اس کا منہ

کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کمرے کا بلب جل رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کھڑکی کی طرف آیا۔ جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گیا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے پٹ کھلے پڑے تھے۔ اب اس نے ایک طرف دیکھا تو اندر ایک عجیب منظر نظر آیا۔

☆☆☆

موت سر پر

شیشہ ٹوٹنے کی آواز ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھی، پھر بھی انہوں نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔ وہ دبے پاؤں اپنے ابا جان کے کمرے کی طرف بڑھے۔ جونہی وہ کمرے کے سامنے پہنچے، بجلی کا بلب جل اٹھا اور کمرے کے اندر روشنی ہو گئی۔ دونوں دروازے پر آئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھے۔ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کانپ اٹھے۔

سر سے پیر تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سیاہ کپڑے میں چُھپا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کی نالی کا رُخ انسپکٹر جمشید کی طرف تھا۔ جو اپنی چارپائی کے پاس ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے تھے۔ بیگم جمشید اپنی چارپائی پر بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر دیکھ رہی تھیں۔ نقاب پوش کہہ رہا تھا۔

"بہت دفعہ بچ چکے ہو انسپکٹر جمشید، اب تمہارا وقت آ چکا ہے۔"

"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔" انہوں نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس کے ہاتھ میں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول

والا ہاتھ سیدھا کر لیا۔

"ٹھہرو۔ کیا تم مجھے دو ایک سوال کرنے کی مہلت بھی نہ دو گے۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، میں جانتا ہوں، تم مجھے باتوں میں لگا کر میرا دھیان ہٹانا چاہتے ہو، لیکن میں اُستاد اعظم خاں نہیں ہوں۔ جس نے بے وقوف قسم کے آدمی تمہارے پیچھے لگا دیئے۔"

"تو تیمور کن کٹے کو تم نے گولی ماری تھی۔"

"ہاں۔ ماری تھی۔ اور اب بس میں کسی اور سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

اس کا پستول تن گیا۔ انگلی ٹرائیگر پر دباؤ ڈالتی چلی گئی

عین اس وقت محمود اور فرزانہ بیک وقت چلائے۔

"خبردار!"

نقاب پوش چونک کر مڑا۔ اسی وقت محمود اور فرزانہ نے چھلانگیں لگائیں اور کمرے کے اندر کود پڑے۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید نے بھی نقاب پوش پر چھلانگ لگائی۔ مگر نقاب پوش کوئی اناڑی نہیں تھا۔ بچوں کی چال کو فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ ایک دم مڑا۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید فضا میں اڑتے ہوئے اس پر آ گرنے کے لئے تیار تھے۔ ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور انسپکٹر جمشید محمود اور فرزانہ کے پاس فرش پر گرے۔ ان کے گھٹنوں میں سخت چوٹ آئی۔ ان کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"بس تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ آج تمہارے بچے بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ عین وقت پر پہنچ گئے تھے اور میں گھبرا بھی گیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اب تم تینوں ہاتھ اٹھا دو۔ میں ان دونوں بچوں اور تمہاری بیوی کے سامنے تمہیں گولی ماروں گا۔ اور ان کی آنکھوں کے سامنے یہاں سے

فرار ہو جاؤں گا۔ ہاتھ اُوپر اٹھا دو۔"

محمود اور فرزانہ نے مایوس ہو کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ انہوں نے اس مسکراہٹ کو حیران ہو کر دیکھا۔ دوسری طرف نقاب پوش بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے احتیاطاً کمرے کے دروازے اور کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

"اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاؤ انسپکٹر جمشید۔" نقاب پوش کے منہ سے نکلا۔

فاروق نے دیکھا۔ کمرے میں ایک نقاب پوش پستول لئے کھڑا ہے اور محمود فرزانہ اور اس کے والد اس کے سامنے ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے ہیں۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ نقاب پوش کا منہ کھڑکی کی طرف تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن اب ایسا کرنا خود بھی پستول کی زد میں آنے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اچانک اس نے نقاب پوش کو کہتے سنا۔

"اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاؤ انسپکٹر جمشید۔"

عین اس وقت فاروق کا ذہن کام کر گیا۔ اس نے دو انگلیاں منہ پر رکھیں اور سیٹی بجا دی۔ آواز بالکل پولیس کی سیٹی کی تھی۔ نقاب پوش نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جو فاروق کی سیٹی نے انسپکٹر جمشید کے لئے پیدا کیا تھا۔ انہوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ کر ایک مکا نقاب پوش کے منہ پر ایسا مارا وہ چاروں شانے چت پڑا...... ابھی انسپکٹر جمشید اس پر جھپٹنے والے ہی تھے کہ اس نے پستول بجلی کے بلب پر دے مارا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ اس جدوجہد کے دوران فاروق بھی کھڑکی پھلانگ کر اندر آ گیا۔

انسپکٹر جمشید نے کمرے کے فرش پر اس جگہ چھلانگ لگائی جہاں نقاب پوش گرا تھا لیکن وہ فرش سے ٹکرائے۔

"ارے وہ نکل گیا۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

انہوں نے کھڑکی کے راستے نقاب پوش کو بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ فاروق کھڑکی کے نزدیک تھا۔ سب سے پہلے وہ کھڑکی سے باہر نکلا اور نقاب پوش کے پیچھے دوڑا لیکن اس کی رفتار فاروق سے بہت زیادہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا اور کھڑکی کے راستے پائیں باغ میں کود گیا۔ فاروق اس کے پیچھے باغ میں کودا اور دوڑ پڑا۔ نقاب پوش دیکھتے ہی دیکھتے گلی پار کر گیا اور فاروق جس وقت سڑک کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ نقاب پوش اسی کار میں بیٹھ کر جا چکا تھا۔ کار لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

اس وقت محمود فرزانہ اور انسپکٹر جمشید دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

"کیا ہوا۔ کیا وہ نکل گیا۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہاں اس کی کار کھڑی تھی۔"

"اوہ یہ بہت بُرا ہوا۔"

"لیکن ابا جان! میرے خیال میں اتنا بُرا نہیں ہوا ہے۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب!" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"وہ اپنا پستول تو یہیں چھوڑ گیا ہے۔ کیا اس سے پتا نہیں چل سکتا کہ وہ کس کا ہے۔"

"یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ پستول اس نے کہیں سے چُرایا ہو۔ یا پھر کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک سے خریدا ہوا ہو۔ ایسی

صورت میں پستول سے یہ پتا چلانا بہت مشکل ہوگا کہ وہ کس کا ہے۔''

''ہوں۔ فاروق ہم نے تمہیں گھر سے باہر نکل کر کسی کار یا موٹر سائیکل کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔'' اب محمود فاروق کی طرف مڑا۔

''تو میں کب کہتا ہوں کہ نہیں بھیجا تھا۔''

''تو پھر۔ کیا تم نے اس کار کو نہیں دیکھا تھا۔''

''کیوں نہیں دیکھا تھا۔ ضرور دیکھا تھا۔'' فاروق بولا۔

''تو پھر تم نے اس کے نمبر نوٹ نہیں کیے۔''

''کیا مطلب۔ تو کیا تم اس کار کے نمبر نوٹ کر چکے ہو۔'' انسپکٹر جمشید خوشی سے چلائے۔

''جی ہاں۔ بالکل۔''

''وہ مارا۔ یہ کام کیا ہے تم نے۔ بھئی بہت خوب۔ لاؤ وہ نمبر مجھے دو۔ اب مجرم میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔''

فاروق نے وہ کاغذ جیب سے نکال کر انہیں دے دیا جس پر اس نے نمبر لکھے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے اسے ایک نظر۔۔۔ دیکھا اور پھر بولے۔

''اب ہمیں آرام سے سو جانا چاہیے کیونکہ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اب اس سلسلے میں صبح ہی کچھ کریں گے۔''

اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔

☆☆

صبح سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے بیگم شیرازی کے ہاں جا کر کاروں کی رجسٹریشن کے دفتر فون کر کے وہ نمبر انہیں بتائے اور پوچھا کہ یہ کار کس کی ہے۔ دوسری طرف سے تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک نام دیا گیا۔ انسپکٹر جمشید اس کا

نام سن کر چونک اٹھے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ وہ شخص مجرم ہوگا۔ وہ خاموش واپس آئے تو فرزانہ نے کہا۔

''کیا بات ہے ابا جان! آپ چپ چپ ہیں۔''

''بیٹی کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''کیا کار کے مالک کا پتا نہیں چلا۔'' فاروق نے پوچھا۔

''چل گیا ہے۔''

''کسی کی ہے وہ کار؟'' تینوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ ویسے مجھے ڈر ہے کہ شاید میں اسے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔''

''کیوں۔ ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ شام کو تمہیں بتاؤں گا۔''

وہ بے حد فکر مند لگ رہے تھے۔ اسی عالم میں انہوں نے ناشتا کیا اور دفتر چلے گئے۔ تینوں ان سے کوئی اور سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ آج انہیں اسکول سے چھٹی تھی اس لئے اپنے کمرے میں جا کر اسکول کا کام کرنے لگے لیکن اسکول کا کام کرنے میں ان کا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار ان کا خیال اپنے والد کی طرف چلا جاتا۔ انہوں نے آج تک انہیں اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''خدا جانے ابا جان کو کیا پریشانی ہے۔ اب تو مجرم کا نام بھی معلوم ہو گیا ہے۔ اس کا پستول بھی ان کے پاس ہے اور تیمور کن کٹے کے پیٹ سے نکلنے والی گولی بھی ان کے پاس ہے۔'' فرزانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ اس آدمی کو مجرم نہ خیال کرتے ہوں۔'' محمود نے خیال

ظاہر کیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کے فکر مند ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" فاروق بولا۔

"ہوں۔ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔" محمود نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

وہ دوپہر تک اسکول کا کام کرتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ شام کے چار بجے اکرام نے گھنٹی بجائی۔ معلوم ہوا کہ وہ انہیں لینے آیا ہے۔ ان کے والد نے تینوں کو دفتر بلایا تھا۔ حیرت کے عالم میں وہ اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

وہ دفتر پہنچے تو انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ ڈی آئی جی صاحب کے کمرے میں ہیں اور ان کو بھی وہیں بلایا ہے۔ اکرام انہیں لے کر ڈی آئی جی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم!" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"وعلیکم السلام۔" ڈی آئی جی اور انسپکٹر جمشید نے کہا پھر ڈی آئی جی ان تینوں سے بولے۔

"بیٹھو بچو!" وہ تینوں بیٹھ گئے۔ اکرام باہر جا چکا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کہہ رہے تھے۔

"دیکھو جمشید۔ اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اب غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی کار کے نمبر فاروق نے اس وقت نوٹ کیے جب وہ میرے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ جس وقت وہ بھاگا ہے تو

فاروق اس کے پیچھے سڑک پر پہنچ گیا اور اس نے اپنی آنکھوں سے اسے کار میں بیٹھ کر فرار ہوتے دیکھا۔ اس کا پستول میرے پاس ہے۔ اور تیمور کے جسم سے نکلنے والی گولی بھی۔ میں پستول سے ایک گولی چلا کر دیکھ چکا ہوں۔ دونوں گولیوں کے نشانات میں ایک رتی بھر بھی فرق نہیں ہے۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کیوں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔"

"وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے ان الزامات کا جواب سوچ رکھا ہو گا، جو تم اس پر لگاؤ گے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میرے پاس اس کے خلاف ایک ثبوت اور بھی ہے۔"

"اور وہ کیا ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"وہ میں اس کے سامنے ہی بتاؤں گا۔"

"خیر۔ اگر تم اتنے ہی پُر یقین ہو تو میں تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ ہم ناکام لوٹیں گے اور پھر وہ ہمیں کہیں کا نہ رہنے دے گا۔"

"ساری ذمہ داری میں اپنے سر لے لوں گا۔ آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا!" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا خیر۔ چلو۔ کیا تینوں بچے بھی ساتھ چلیں گے۔"

"جی ہاں۔ ان ہی کی وجہ سے کل میں اس کے ہاتھوں سے بچ گیا۔ ویسے بھی یہ تمام حالات سے واقف ہیں اور وقت پر خوب کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے۔ اس وقت انسپکٹر جمشید نے اکرام کے کان میں کچھ کہا اور وہ سر ہلا کر اپنی جیپ میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے

جانے کے بعد انسپکٹر جمشید نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی۔ تینوں بچے یہ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

ایک بہت بڑی کوٹھی کے سامنے ان کی جیپ رکی۔ وہ نیچے اتر کر کوٹھی کے دروازے کی طرف بڑھے۔ انسپکٹر جمشید نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم نے آکر دروازہ کھولا۔

"جی فرمایئے!"

"ہمیں تمہارے صاحب سے ملنا ہے۔ ان سے کہو ڈی آئی جی صاحب آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"آپ لوگ اندر تشریف رکھئے۔ میں انہیں خبر کرتا ہوں۔"

ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اطلاع دینے چلا گیا۔ چند منٹ بعد انہیں قدموں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ دروازے میں سے گزر کر آنے والا سردار کابلی والا کے سوا کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

چالاک مجرم

ان کے منہ کھلے کے کھلے اور آنکھیں حیرت کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے کابلی والا کو کہتے سنا۔

"آپ لوگوں نے کیسے تکلیف فرمائی؟"

"یہ پستول آپ کا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جیب سے پستول نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے پستول کو نالی کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔

"ہاں۔ میرا ہی ہے۔ آپ کو کہاں سے ملا۔" سردار کابلی والا حیران ہو کر بولا۔

"آپ اس پستول کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے الٹا سوال کیا۔

"میں اسے اپنی کار کے خانے میں رکھتا ہوں۔ کل صبح جب میں نیو مارکیٹ کسی کام سے گیا تھا تو کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی تھی۔ واپس پہنچا تو کار غائب تھی اور اس کے ساتھ یہ پستول بھی تھا۔"

"آپ نے ان دونوں کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی؟"

"ہاں۔ میں اپنے حلقے کے تھانے میں رپورٹ درج کرا چکا ہوں۔"

"ہوں! کار آپ کو واپس مل چکی ہے یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ

سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں ملی۔''

''اسی پستول سے مجھ پر حملہ کیا گیا ہے، اور اس سے پہلے ایک شخص تیمور کن کٹے کو ہلاک کیا جا چکا ہے۔''

''کیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' سردار کابلی والا حیران ہو کر بولا۔

''اور اس پستول کے دستے پر انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ جن کے فوٹو لئے گئے ہیں۔''

''یہ آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔''

''اس پستول سے نکلنے والی گولی نے ہی تیمور کن کٹے کو ہلاک کیا ہے، یہ باتیں ماہرین نے گولیوں کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم کی ہے، اور ان کی رپورٹ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔''

''تو پھر۔ میں کیا کروں۔ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔'' اس مرتبہ کابلی والا کا لہجہ غصیلا تھا۔

''اس لئے کہ پستول آپ کا ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے باغ میں داخل ہو کر پارسل اسی نے آپ کو دیا تھا۔''

''کیا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' سردار کابلی والا اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔ ڈی آئی جی صاحب اور تینوں بچوں کو یہ حیرت بالکل اصلی معلوم ہوئی۔

''ہاں! آپ نے اس شخص کا حلیہ بھی بتایا تھا کہ اس کے کان کی لو کٹی ہوئی ہے۔ ایک ایسے شخص کو ہم بخوبی جانتے تھے، کیونکہ وہ بہت چالاک مجرم تھا اور

کئی بار کا سزا یافتہ بھی تھا جب میں نے اسے تفتیش کے لئے بلایا اور اسے حوالات بھیجنے لگا تو آپ کے پستول سے اسے ہلاک کر دیا گیا۔'' انسپکٹر جمشید پرسکون انداز میں کہتے چلے گئے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید کوئی شخص مجھے پھانسنے کی کوشش میں ہے، پہلے اس نے ایک جرائم پیشہ کو ایک پارسل دے کر میرے پاس بھیجا، پھر اس شخص کو ہلاک کر دیا اور وہ بھی میرے ہی پستول سے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی مجھے پھانسنا چاہتا ہے۔''

''میں جانتا تھا۔ آپ یہی کہیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

''آپ جانتے ہیں۔ اس پارسل میں کیا تھا؟''

''بھلا مجھے کیا معلوم۔ اس کن کٹے نے کہا تھا کہ اس میں ملک و قوم کی کوئی امانت ہے۔''

''یہ بات ثابت ہونے کے بعد کہ وہ ایک جرائم پیشہ تھا، اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے۔''

''تو پھر۔ اس میں کیا تھا۔''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ کیونکہ ابھی میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔''

''ارے۔ ابھی تم نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ سردار کابلی والا نے پھر حیران ہو کر کہا۔

''جی نہیں۔''

"آخر کیوں؟"

ابھی انسپکٹر جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

☆☆

سردار کابلی والا کا ملازم اندر داخل ہوا اور ادب سے بولا۔

"حضور کوئی صاحب اکرام نامی آئے ہیں، اپنے آپ کو انسپکٹر جمشید کا اسسٹنٹ بتاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، اُسے یہیں لے آؤ۔" سردار کابلی والا کے کچھ کہنے سے پہلے انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"جی اچھا!" ملازم نے کہا اور باہر چلا گیا۔

"آخر چکر کیا ہے۔ یہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے آپ لوگ آئے، اب آپ کا ایک عدد اسسٹنٹ بھی آ رہا ہے، مجھے حیرت ہے۔ ڈی آئی جی صاب۔ یہ سب کیا ہے۔"

"اس کا جواب انسپکٹر جمشید ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی نے فکر مند ہو کر کہا۔

اسی وقت اکرام اندر داخل ہوا۔

"لے آئے اکرام۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہا! یہ رہا۔" اکرام بولا۔ انہوں نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی پارسل تھا۔

"بہت خوب۔ اسے میز پر رکھ دو۔"

"اکرام نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد انسپکٹر جمشید بولے۔

"سردار صاحب۔ یہ وہی پارسل ہے نا۔"

"ہاں! وہی ہے۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر اسے آپ ہی کھول ڈالیں۔"

"کیوں۔ میں کیوں کھولوں۔"

"یہ ہم سب کی خواہش ہے۔"

"اچھا۔ کھولے دیتا ہوں۔"

سردار کابلی والا نے پارسل اٹھایا اور میز کی دراز کھول کر اس میں سے ایک چاقو نکالا۔ اس وقت انسپکٹر جمشید بھی دنگ رہ گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پارسل میں بم سردار کابلی والا نے ہی بھیجا ہے اور اس صورت میں سردار کابلی والا ہرگز اسے کھولنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بغور سردار کابلی والا کو دیکھنے لگے۔

کابلی والا نے چاقو سے پارسل کا کپڑا کاٹا ہی تھا کہ چونک اٹھا اس کے ہاتھ رک گئے۔

"نہیں، میں اسے نہیں کھولوں گا۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی خطرناک چیز ہو۔"

"آپ کھولئے تو سہی۔"

"نہیں۔ میں اسے نہیں کھولوں گا۔ مجھے ضرورت ہی کیا ہے۔"

"تو آپ جانتے ہیں۔ اس میں کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے تیز لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر! تم ہوش میں تو ہو۔ جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو، ایسے لہجے میں بات سننے کا عادی نہیں۔ ہوش میں رہ کر بات کرو۔ شیخ صاحب آپ دیکھ

رہے ہیں۔''

''جمشید۔ نرمی سے بات کرو۔'' ڈی آئی جی صاحب نے گھبرا کر بولا۔

''جی بہت اچھا۔ اب میں بہت ہی نرمی سے بات کروں گا۔ سردار کابلی والا صاحب ذرا میری بات غور سے سنئے۔ یہ پارسل آپ نے مجھ تک پہنچایا تھا، پہنچانے والے کا حلیہ آپ نے یہ بتایا کہ اس کے کان کی لو کٹی ہوئی ہے، ہم ایسے آدمی کو جانتے تھے، جب ہم نے اس پکڑ بلوایا تو آپ کے پستول سے اسے ہلاک کر دیا گیا۔ آج رات اسی پستول سے مجھ پر میرے مکان میں حملہ کیا گیا۔ حملہ آور جاتے ہوئے اپنا پستول نہ لے جاسکا۔ سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کار کے نمبر میرے لڑکے نے نوٹ کئے۔ حملہ آور اسی کار میں بیٹھ کر میرے لڑکے کے سامنے فرار ہوا۔ میں آپ پر الزام لگاتا ہوں کہ وہ آپ ہی تھے جس نے تیمور کن کٹے کو ہلاک کیا، اور پھر رات کو مجھ پر حملہ کیا۔ اس پستول پر انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔''

''یہ کیا بکواس ہے، میں نے اس سے زیادہ فضول گفتگو آج تک نہیں سنی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میری کار اور پستول چوری ہو گئے تھے۔''

''اس صورت میں آپ کو اپنی انگلیوں کے نشانات دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''کیا مطلب!''

''اگر آپ مجرم نہیں ہیں تو آپ ہمیں اپنی انگلیوں کے نشانات دے دیں، ہم ان نشانات کو پستول پر پائے جانے والے نشانات سے ملائیں گے، ظاہر ہے کہ اگر آپ مجرم نہیں ہیں تو وہ نشانات آپس میں ہرگز نہیں ملیں گے۔''

''میں نشانات دینے سے انکار کرتا ہوں۔ تم میرا جرم ثابت کرو۔''

''بہت خوب۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں سردار صاحب کی خدمت میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جرم ثابت ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب!''

''انگلیوں کے نشانات دینے سے انکار کرنے کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ جرم آپ نے ہی کیا ہے۔''

''میری انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کے احکامات حاصل کرو۔'' سردار کابلی والا نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں، میرے پاس ابھی ایک ثبوت اور بھی ہے۔ جو تیسرا اور مکمل ترین ثبوت ہے۔''

''کیا مطلب۔ تیسرا ثبوت۔؟'' ڈی آئی جی صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

''جی ہاں۔ ان کا پارسل نہ کھولنا پہلا ثبوت ہے، انگلیوں کے نشانات نہ دینا دوسرا ثبوت ہے، تیسرا یہ ہے کہ اس پارسل پر جو جملہ لکھا ہوا ہے، وہ جناب سردار صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔''

''کیا!!!'' وہ چلائے۔

''جی ہاں۔ سردار صاحب کو یاد ہوگا کہ پارسل وصول کرتے وقت میں نے ان سے ایک تحریر بھی لی تھی، تحریروں کے ماہرین کا کہنا ہے کہ دونوں تحریریں سو فیصد ایک ہی آدمی کے ہاتھ کی ہیں۔ لہٰذا سردار صاحب خود کو قانون کے حوالے کر دو...... اکرام! ان کے ہتھکڑیاں لگا دو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

اکرام ہتھکڑی لئے آگے بڑھا۔ اس وقت سردار کابلی والا گرجا۔

''خبردار! اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔''

انہوں نے چونک کر دیکھا سردار کابلی والا کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا
بڑا پستول تھا۔ یہ اس نے میز کی دراز سے نکالا تھا۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' اس نے گرج کر کہا۔

ان کے ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔ انسپکٹر جمشید کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ
تھی۔

''میں تم سب کو اس کمرے میں بھسم کر دوں گا اور کسی کو کانوں کان خبر تک
نہ ہو گی کہ یہاں کوئی آیا تھا۔''

''تو کیا تمہیں اپنے جرموں کا اقرار ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ہاں ہاں۔ میں اقرار کرتا ہوں، تیمور کن کٹا میرا ہی آدمی تھا، اسے میں
نے ہی مارا۔ میں نے ہی ایک جگہ پارسل رکھ کر اسے فون پر ہدایت کی تھی کہ یہ
مجھے پہنچا دے۔ یہ تو وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا باس میں ہی ہوں۔ اس نے تو
اپنے باس کی کبھی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اور استاد اعظم اور اس کے ساتھی بھی
میرے ہی آدمی ہیں۔ یہ سب کچھ میں نے تمہیں ختم کرنے کے لئے کیا تھا مگر تم
بچ نکلے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب میں تمہیں ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''کوشش کر دیکھو۔ تمام آفیسروں کو معلوم ہے کہ ہم تمہارے ہاں آئے
ہوئے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''کوئی پروا نہیں، میں کہہ دوں گا کہ تم لوگ میرے ہاں آئے ضرور
تھے، چند منٹ بیٹھ کر چلے گئے۔''

''اور ہماری لاشیں۔ ہم چھ ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

''اس گھر میں نوکروں کی ایک پوری فوج ہے۔ یہ نوکر عام نوکر نہیں ہیں۔
سب کے سب سزا یافتہ مجرم ہیں۔ انہی کے ذریعے میں تمہاری لاشوں کو ٹھکانے
لگوا دوں گا۔''

''تو تم چرس، افیون، بھنگ اور شراب کا کاروبار ان کے ذریعے ہی
کرتے ہو۔''

''نہیں۔ انہیں تو معلوم ہی نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا کام کرتا ہوں۔ یہ
بات تو استاد اعظم خان اور تیمور کن کٹے کو بھی معلوم نہیں۔''

''پھر آخر تم کاروبار کس طرح کرتے ہو۔''

''انہی لوگوں کے ذریعے۔'' سردار کابلی والا نے مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب!'' انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

''مطلب یہ کہ وہ میرے لئے کام کرتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں۔ وہ تو
ایک نامعلوم آدمی کے لئے کام کرتے ہیں جو انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتا ہے
اور اس نامعلوم آدمی نے ہی انہیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ سردار کابلی والا کے
گھر میں عام ملازموں کے بھیس میں رہو۔ اس گھر میں تمہیں تمام منشیات مل جایا
کریں گی؟''

''اور وہ نامعلوم آدمی تم ہی ہو۔''

''بالکل۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا۔ سوائے تمہارے۔ اس لئے تم سب اس
کمرے سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔''

''بہت اچھا! ہم مرنے کے لئے تیار ہیں۔ تم گولی چلاؤ مگر حیرت ہے
تمہارے پاس آخر کتنے پستول ہیں۔ ایک پستول تو یہ میرے پاس ہی ہے۔'' یہ
کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ہاتھ جیب کی طرف لے جانا چاہا۔ اس وقت سردار کابلی
والا چلایا۔

''خبردار انسپکٹر۔ میں تمہاری چالاکیوں سے خوب واقف ہوں۔ اپنے

ہاتھ اوپر ہی رکھو۔

☆☆

تینوں بچے حیران اور پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ ان کے والد نے اچانک بلایا تھا اور یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ کس مہم پر روانہ ہونا ہے، ورنہ وہ گھر سے پروفیسر داؤد کے دیئے ہوئے تحفے ضرور لے کر چلتے۔ اس وقت وہ تینوں خالی ہاتھ تھے اور انکے ذہن اس سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کیا کریں۔

''وہ بالکل کابلی والا کے سامنے کھڑے تھے۔ اگر دائیں بائیں ہوتے تو ضرور کچھ کر سکتے تھے۔ اچانک فرزانہ کی نظر میز پر پڑی۔ وہ میز کے بہت نزدیک تھی۔ اس میر پر وہی پارسل رکھا تھا جس کے اندر بم تھا اور جس میں سردار کابلی والا نے اس کے والد کی موت کا پیغام بھیجا تھا۔ اس وقت وہ اس کی پہنچ سے دور نہیں تھا اور کسی کا خیال اس طرف تھا بھی نہیں۔ سب لوگ تو اس کے والد اور مجرم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں محو تھے۔ اس نے ایک نظر سردار کابلی والا پر جمائے اس نے اپنا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گرانا شروع کیا بالکل ایسے انداز میں جیسے ہاتھ اوپر اٹھے اٹھے تھک گیا ہو۔ ہاتھ دھیرے دھیرے گرنے لگا۔ دوسری طرف سردار کابلی والا کہہ رہا تھا۔

''موت تم پر ہنس رہی ہے انسپکٹر۔ اتنے خطرناک حملوں سے بچ نکلنے والا انسپکٹر آج چیونٹی کی طرح مسل دیا جائے گا۔ میں حیران ہوں کہ تمہارا اس قدر نام کیوں ہے۔ تم تو بالکل چوہے کی طرح پکڑے گئے اور اب میں بلی کی طرح تم سے کھیل رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت اس کے پستول والے ہاتھ سے کوئی چیز ٹکرائی۔ پستول اس

کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جسے انسپکٹر جمشید نے لپک کر دبوچ لیا۔

''بہت خوب۔ وہ مارا۔ ڈی آئی جی خوشی سے اچھل پڑے۔

''فرزانہ تم نے کمال کر دیا۔ پارسل اٹھا کر دے مارنے کا خیال ہم میں سے کسی کو بھی نہیں آیا۔'' اکرام بولا۔

''اور اب مسٹر سردار۔ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''

''ہاں میں ہار گیا۔ تم جیت گئے۔ آؤ اور بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔''

سردار کابلی والا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ لڑکھڑایا اور فرش پر گر پڑا۔ وہ عین پارسل پر گرا تھا جس کا کپڑا وہ پہلے ہی چاقو سے کاٹ چکا تھا۔

''ارے اسے کیا ہوا۔'' ڈی آئی جی کے منہ سے نکلا۔

''شاید صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے۔'' اکرام بولا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھے۔ سردار کابلی والا لیٹے لیٹے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم لوگ مجھے ہتھکڑیاں نہیں پہنا سکتے۔ یہ دیکھو۔ میں خود کو موت کے حوالے کر رہا ہوں۔''

انہوں نے گھبرا کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے پارسل کا کپڑا الگ کر رہے تھے۔

''ارے ارے۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔'' انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

''خبردار۔ پارسل سے کپڑا نہ اتارو۔'' اکرام نے گرج کر کہا لیکن اتنی دیر میں کپڑا کھل چکا تھا۔

''کمرے کی دیوار کی طرف دوڑو۔'' انسپکٹر جمشید چلائے۔

وہ سب کابلی والا سے دور دیوار کی طرف دوڑے۔

''لیٹ جاؤ۔'' پھر چلائے اور وہ سب کے سب لیٹ گئے۔

عین اس وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ دھماکا اس قدر خوفناک تھا کہ وہ لرز کر رہ گئے اور چند سیکنڈ کے لئے ان کے حواس بالکل گم ہو کر رہ گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو دیکھا سردار کابلی والا فرش پر پڑا تھا۔ اس کا سر دھڑ سے غائب تھا۔ اس کے کندھے نظر آ رہے تھے۔ گردن تک اڑ گئی تھی۔ فرش پر ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اور دیواروں پر اس کے بھیجے کے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ دہشت ناک منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کانپ کر رہ گئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ اپنی چیخیں کسی طرح نہ روک سکے۔ سردار کابلی والا اپنے گھر میں تنہا ہی رہتا تھا۔ اس کا کوئی عزیز اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔

اکرام نے فون کر کے پولیس کی ایک پوری جمعیت منگوائی اور سردار کابلی والا کے تمام ملازموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہی نہیں، اس مکان کے بعض کمروں سے نشہ آور چیزوں کی بہت بڑی مقدار پکڑی گئی۔

واپسی پر ڈی آئی جی صاحب نے فرزانہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''اگر فرزانہ اس کے ہاتھ پر پارسل نہ مار دیتی تو ہم اس وقت کہاں ہوتے۔''

''ابا جان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' فاروق نے پوچھا۔

''پوچھو۔''

''آخر سردار کابلی والا نے تیمور کن کٹے کو کیوں مار ڈالا۔ اس سے اسے کیا

خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔''

''کوئی خطرہ بھی نہیں۔ بس سردار کابلی والا ہمیں الجھائے رکھنا چاہتا تھا اور تیمور کے مرنے کے بعد تو میں سچ مچ یہ سمجھنے لگ گیا تھا کہ وہ پارسل واقعی سردار کابلی والا کو انہی حالات میں ملا تھا جن کا ذکر اس نے کیا تھا۔''

''ہوں! میں سمجھ گیا۔''

''ایک سوال میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔'' محمود بولا۔

''وہ کیا!''

''تیمور کے منہ سے مرتے وقت رکاب کا لفظ نکلا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔''

''اوہ! اس کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اب تمہارے یاد کرانے پر یاد آیا۔ اوہ۔ اب تو اس کا مطلب بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔'' انسپکٹر جمشید چونکے۔

''کیا مطلب!'' ان کے منہ سے نکلا۔

''تیمور نے دراصل گولی چلانے والے کے چہرے کو دیکھ لیا ہوگا۔ اس وقت چونکہ دن کا وقت تھا اس لئے مجرم نقاب پہن کر نہیں نکلا تھا۔ جب اس نے تیمور پر گولی چلائی تو اس نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ یہی وجہ تھی کہ مرتے وقت اس کے منہ سے لفظ رکاب نکلا۔'' انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

''ہم اب بھی نہیں سمجھے۔'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''بھئی بات صرف اتنی ہے کہ تکلیف میں اس کے منہ سے اپنے قاتل کا نام پوری طرح نہ نکل سکا۔ سردار کا صرف ''ر'' نکلا اور کابلی والا کا ''کاب''۔ اس طرح اکرام کی سمجھ میں جو لفظ آیا وہ رکاب تھا۔''

''اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس پر پہلے کیوں نہ دھیان دیا۔ ورنہ مجھے فوراً

پتا چل جاتا کہ مجرم کون ہے۔''

''ہوں۔'' ڈی آئی جی کے منہ سے نکلا۔

دوسرے دن کے اخبارات اس واقعے سے بھرے پڑے تھے۔ ان خبروں میں فرزانہ کے کانوں کا بھی ذکر تھا جسے پڑھ کر وہ بہت ہنسے۔

------------☆☆☆------------

اٹلانٹس پبلیکیشنز
D-83 سائٹ۔ کراچی
فون: 2581720 - 2578273
e-mail: atlantis@cyber.net.pk